

# الحمد لله

نوره احمد

19

# حکام

تالیہ خواب میں قاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ تالیہ سے اپنی فاکس کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلکہ کر کے سڑک لٹھو لٹھو کرتی ہے، مگر سڑک اس کے ہاتھ میں نہ دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ قاتح صاحب کے ذریعے قاتح کو عالم کا پتا چلتا ہے۔ فاکس کی واپسی کے لیے عالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور منصوبے میں قاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ قاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اثر ہے۔ عالم پتا چلا لیتا ہے کہ فاکس اشعر کے آفس میں ہے۔

صبح تالیہ کو بلکہ میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، صبح کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ عالم جان پہ کھیل کے روز ہی فاکس اشعر کے سف سے چر اگر لادیتا ہے۔ قاتح، عالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ دو تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے قاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو قاتح اور اشعر دونوں آتا ہے۔ قاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی قاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کتوں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ قاتح سے





کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ مگر وہ اسے پہنچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ مصر اور یہاں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آ یاد دھو کے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گراہنے سے باپ کا رن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفن کر دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کڑی کھینچتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کر لیا تھا۔

ایڈم ملا کہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسیلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم ملک میں چکر راستے میں فاتح کو پہنچ جاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر ہند ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ وہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سہاٹی خزانے لگتی ہے کہ وہ چند سو صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے کھل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر مکمل جاتا ہے کہ تالیہ ہی عالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے ٹھٹھکا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگ لگتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے کاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھار رہی ہے اور اس نے تالیہ کے کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا قہقہہ ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنادے گا۔ وہ اسے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کسانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو توجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور جانی زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگ لگتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک قدیم خانے میں جاتے ہیں۔ پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسیلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار

لے بہنٹی لایا تھا۔ وہ مکمل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم تالیہ پر چوری کا نالہ الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سکتی ہے۔

یتیم خانے میں مسز ڈو الٹن آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پورا کر سکیں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزارتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر چل کا اسلحہ بناتی ہے۔ ذرا

اسے پہلے کتاب اور سکے کا ایک شعبہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔ ذرا الٹن ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آتا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے تھا اور موقع ملنے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسلحہ ہوائی ہے۔ تو وہ غلط اسلحہ بنا کر اسے چھپاتی ہے۔

تالیہ کو ہمارے یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جاتا ہے۔ جہاں اس پر اس کی لاش کے لٹل کا مہو نا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ مایوسی کو بردہ کرتی ہے۔ جہاں اس نے ہاآ خر ذرا الٹن کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذرا الٹن نے اسے اپنا سارا ہنر دکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو ”ابو الخیر“ نامی آدمی کے کارندے ایک بنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قید

تالیہ کے طور پر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایلام کو آزاد کرنا چاہتی ہے۔ مگر قلع کو آزاد کرانے سے پہلے انہوں کا رویہ کونسا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں قلع کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ قلع کو ایک قید خانے میں قفل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں ایک "ایجو" تھری کے ساتھ ہر اسلوگ کیا جاتا ہے۔

قید میں قلع کو اور ایک ایسا ہتھکڑیاں میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے تہم و کیم میں پھرنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی قربانیت سے وہ دونوں اپنے انہوں کا رویہ بدل کر محسوس بدل کر طور میں ہی بھرتے ہیں۔ یہاں تالیہ یہ افکشاف کرتا ہے کہ وہ خود اپنے انہوں کا رشتہ اور بندہ بار کی بنی ہے۔ بندہ بار اور اپنے ساتھیوں سے غداروں کی کر کے انہیں چاروں دروازے اور خود بیا شدت سے جو اس کا "انہوں" کو اپنے میں جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چیر ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر چکی ہے اور وقت کا دورہ ادا دیا کر چکی ہے۔ راجہ مراد تالیہ کو اپنی جیل میں شکی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایلام، وہ ان قلع کو ایوانہ کی غلامی میں کام کرتے ہوئے موقع یا کرتالیہ کے بارے میں جانتا ہے قلع اس تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلع کے کنہ و اثر و توجہ میں ایلام بھی شامل ہے۔ مگر قلع کو ایلام کے مختلف مزا کیسے دیتا ہے ایلام کو شامی کتب خانے میں کام کرنے کی ہر ہمتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر حیرت لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائکہ واپس آ جاتی ہے۔ یہی مگر راجہ مراد کے طاقت کا اور غلام کا مظاہرہ کرتے تالیہ کو خود کو قید کر دیتا ہے۔ راجہ کی خواہش کے تحت شریک اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی مکر و فریب سے بچا کر اس کی وفاداری میں رہتی ہے۔

ملکہ یان سینہ جیش بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مراد کی بیٹی ہے۔ مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے ساتھ ملکہ یان سینہ بادشاہ مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ ان قلع کو ایوانہ اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے انہیں نقد اکس کھانے کو دیتا ہے کہ شادی میں اس غلام کی راجہ قیمت ملے۔

تالیہ، قلع سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تھے مگر قلع نہیں جانتا۔ ایلام "یادگار ایلامی" کے ہاتھ کو تھماتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب صحتی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تحصیل لیتی ہے۔

ایوانہ شامی خزانہ بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے مترشح ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوئو "واگف" کی "کوشا" خزانہ بننا چاہتی ہے۔ مراد، ایوانہ کو وہاں قلع محسن بانو کے "واگف" سے مترشح دعوت میں من بانو "واگف" کی بھی موجود ہوتا ہے۔ ایوانہ اس سے غطر و محسوس کر کے قلع کے ہاتھوں سے زبردلوں سے مرق قلع "واگف" کی کو خیر و دار کر دیتا ہے۔

قلع، "واگف" سے بے حد مترشح ہے اور اسے خزانہ کی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ایوانہ کو خزانہ بنانے کی سہارا کر لیتی ہے۔ قلع کو یہ بات نام کو گزر رہی ہے۔ تالیہ، ایلام کو شامی مورخ قیصرات کرتی ہے۔ قلع تمام غلاموں میں آکر لڑائی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قلع کے لیے آدھی قیصرات کر دیتا ہے اور ہر اورے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شامی مورخ سے اپنی جھوٹی تقریریں کھولتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی حفاظت لیتی ہے تو اس پر افکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ خیر و طہر پر کمالی مٹی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر ہر حاصل کرنے کے لیے ایوانہ سے راجہ کو کہتی ہے۔ قلع کو ہٹا مل جاتا ہے، وہ ہاراض ہوتا ہے اور بنیادی میں "واگف" کی کاغذ نام بنے کو ترجیح دیتا ہے۔ قلع مستحسن کی باتیں بنا کر "واگف" کی کو مترشح کرتا ہے۔

یان سوئو کے والد کو بادشاہ مراد کی غفلت جاننے سے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستحسن قلع کا پانی چاہتی ہے مگر شامی طبیب آنا کافی کرتا ہے۔ تالیہ مدافعت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی



کروا جاتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔  
 قانع کے کہنے پر محمود مرنی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت قانع کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔  
 رجبہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر قانع کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ رجبہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کر داتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ جاتی ہے اور فاتحہ کو خبردار کرتی ہے۔ رجبہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔

ملکہ یان سو فو کی کنیر یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔  
 تالیہ، عصرہ کو نیلامی والے دن گھاس غزال کی نقلی پینٹنگ کے اسکیٹل سے بچا لیتی ہے اور سن باؤ والے گھر کو کرائے پر حاصل کرنے کی بات کرتی ہے۔ وان قانع ایڈم سے اس رات کی بابت دریافت کرتا ہے۔  
 تالیہ کے گھر سچ آتا ہے اور اسے دھمکا تا ہے۔ تالیہ اسے کہتی ہے کہ وہ اب اس سے ڈرتی نہیں ہے۔  
 وان قانع حاکم (تالیہ) کو فون کرتا ہے اور اس سے اس رات کے بارے میں معلومات کے لیے کہتا ہے۔  
 اشعرنا شتے پر تالیہ سے ملنے جاتا ہے وہاں رمی اس سے کہتا ہے کہ نقلی خریدار پینٹنگ کے پیسے مانگ رہا ہے۔ اشعرنا سے سخت کہتا ہے۔ تالیہ اشعر کو ہنسی ہنسی میں بہت کچھ جتا دیتی ہے۔ اشعرنا چاہتے ہوئے بھی مسکرا کر اس کی بات سنتا ہے۔ تالیہ وان قانع کے آفس میں اس سے نوکری دلوانے کا کہتی ہے۔

ایڈم کی ماں اس سے کہتی ہے کہ وہ جلد از جلد نوکری ڈھونڈے ورنہ اس کی مستقبل ختم ہو جائے گی۔  
 تالیہ وان قانع کے آفس جاتی ہے وہاں سچ اسے بلیک میل کرتا ہے تو وہ واش روم میں اسے بلا کر اپنے ہیرے کے ٹاپس دے دیتی ہے۔  
 عصرہ کے بچے وان قانع کے کمرے سے چرائی فائل کے بارے میں جانتے ہیں۔ عصرہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔  
 بچوں کو دھمکا جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے۔

PakiBooks.Site

## انیسویں قسط

گیلے بالوں اور کپڑوں کے ساتھ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اب ایک بھرپور چٹھی انجوائے کرنا نظر آ رہا تھا۔

”قانع صاحب.... وان قانع!“

آوازوں سے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ رپورٹرز نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔ اس نے بس مسکرا کے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ مکھڑوں کی طرح اطراف سے اس پر جھپٹے۔ پل بھر میں سامنے پانچ چھ افراد جمع ہو گئے تھے۔ ایک دو نے چھتریاں تان کے باقی سب کو بھی بارش سے بچا لیا تھا۔ کچھ چھتر تلے آگئے تھے۔  
 ”آپ نے کاغذات نامزدگی جمع کروادیے

حاکم سے فون پہ بات کرتے ہوئے سرک پہ تیز تیز چل رہا تھا جب بارش شروع ہوئی۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس کانوں میں بینڈز فری لگائے، اس

نے چہرہ اٹھا کے آسمان کو دیکھا، پھر قدم تیز کر دیے۔  
 قریب میں بس اسٹینڈ کا چھپر بنا تھا۔ قانع نے بات جاری رکھتے ہوئے، جیب سے پانی کی گھیسی سی بوتل نکالی اور شیش کی طرف آگیا۔

حاکم نے ایک دم سے کال کاٹ دی تو اس نے برامانے بغیر بینڈز فری کانوں سے نکالے اور بیچ آ بیٹھا۔ پھر بوتل لبوں سے لگائی اور موبائل کھول کر دیکھنے لگا۔

ہے اور پھر الیکشن سے پہلے بہت سے کاغذات جمع کروائے جاتے ہیں۔“

ہینڈ زفری کانوں میں ڈالتا وہ فٹ پاتھ پہ آگے بڑھا تو رپورٹرز اپنے مائیک اس کی طرف بڑھائے لائے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔

”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اشعر صاحب صرف کوریگ امیدوار ہیں؟ اور وہ بعد میں کاغذات واپس لے لیں گے؟“ ایک لڑکے نے بلند آواز میں پوچھا۔ (کوریگ امیدوار دراصل امیدوار کا حامی ہوتا ہے اور اس لیے کاغذات جمع کرواتا ہے تاکہ اگر اصل کے کاغذات مسترد ہو جائیں تو اس کا گروپ اس کو کھڑا کر سکے۔ مسترد کیے جانے کے فیصلے کے آنے تک کاغذات نامزد کی جمع کروانے کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے۔)

”مگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنی جاگنگ مکمل کر لوں کیونکہ میرے سامنے ایک لمبا دن

ہیں۔ کیا آپ خود کو بی این کا اگلا حیر میں بننے دیکھ رہے ہیں جبکہ کچھ عرصہ پہلے تک آپ کے استعفیٰ کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔“

کسی نے مائیک اس کے چہرے کی طرف کیے سوال جھاڑا۔ وہ مسکرا کے پیچھے ہوا، ایک بازو شیخ کی پشت پر پھیلا دیا اور ٹانگ سے ٹانگ جمالی۔

”وان فاتح استعفیٰ نہیں دے رہا... نہ دے گا۔ میں الیکشن لڑ رہا ہوں اور بالکل لڑ رہا ہوں۔“

”مگر کچھ عرصہ پہلے تک لوگ آپ سے یہ سوال پوچھتے تھے تو آپ جواب گول کر جاتے تھے۔ اب آپ بہت دھڑلے سے الیکشن لڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ کیا تب آپ کو لگتا تھا کہ آپ کو مخالفتوں کے باعث الیکشن سے دستبردار ہونا پڑے گا؟“

”دیکھیں الیکشن لڑنا تو میں اس دن چھوڑوں گا جس دن آپ کو اطلاع ملے گی کہ بعد نماز عصر وان

فاتح کا جنازہ ہے۔ ورنہ اس زندگی میں سیاست میں ایک دفعہ اتر جانے والا اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔“

بارش میں کھڑے رپورٹرز کا تہہ نہ گونجا۔

”مگر فاتح صاحب..... جب سے آپ کی دکانیں جلی تھیں اور آپ کی انوسٹمنٹ ڈوبی تھی عام تاثیر یہ بن گیا تھا کہ آپ کے پاس الیکشن لڑنے کا پیسہ نہیں ہے۔ تو اب آپ کے مالی حالات کیسے ہیں؟“

”اب صوفیہ رتن کی طرح میرے باپ نے بھی کرپشن کر کے لامحدود دولت اکٹھی کی ہوئی تو میرے مالی حالات کو اس آگ سے فرق نہ پڑتا مگر خیر.... میں الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں ہوں۔“

”فاتح صاحب یہ بتائیے: دوسرے رپورٹرز نے سانس لیے بغیر پوچھا: ”نازہ اطلاع ہے کہ کل اشعر محمود بھی چیرمین شپ الیکشن کے لیے کاغذات جمع کرانے جا رہے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

فاتح نے جیب سے ہینڈ زفری نکالے اور ان کی گردہ کھولنا اٹھا۔ ”کاغذات جمع کروانا ہر ایک کا حق

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سوچ منگر کی دانی



وحشیہ جمیل

قیمت - 350/- روپے

منسلب کاغذ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



مہمت مخرطی تھی۔

”آپ اندر آئیے۔ میں اسے جانی پہچانی  
ایسا اسکرٹ سے بندھے رو مال سے ہاتھ دھو کر  
اندروں کو لکھیں۔

”ایڈم۔ ایڈم!“ ماں ایڈم کے کمرے کا  
دروازہ تیزی سے کھول کے اندر داخل ہوئی تو دیکھا  
وہ اسٹڈی ٹیبل پر جھکا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔  
چیک والی سرکس سرٹ پہنے، وہ سارے صحنے میں خود  
ماں کو دیکھ کے چہرہ موڑا اور جھانکی روکی۔

”میں تاشٹے کے لیے آئی رہا تھا۔“

”وہ باہر آئی ہے۔ کہہ رہی ہے ایڈم سے بات  
کرتی ہے۔“

”کون؟“ وہ چونکا۔ ”قاطرہ؟“ بے یقینی سے رقم  
رکھا۔

”نہیں۔ وہ لڑکی جس نے تمہارے بیباک  
خواب سن کے آئین کہا تھا۔“

ایڈم بن محمد کی چند جانی بچھ میں ہی نہیں آیا۔ وہ  
ہونفتوں کی طرح ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”کون؟“

”وہ جو اشعر صاحب کی پارٹی میں موجود تھی۔  
سنہرے بالوں والی۔“

ایڈم اتنی تیزی سے بوکھلا کے کھڑا ہوا کہ اس کی  
ہڈیاں جھنجھنے کی آواز آئی۔

”چے تالیہ؟“

”ہاں۔ یہ وہی ہے نا جو کسی کی نوکرانی تھی اور  
اب خاندانی رئیس بننے کی اداکاری کرتی ہے؟“ لڑکے

نے یاد کیا۔

”وہ کوئی نوکرانی وغیرہ نہیں ہے۔ وہ ملک کے  
اعلیٰ ترین شاعری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

شہزادیوں سے بھی اعلیٰ ہے وہ۔“ وہ بڑے جلدی  
جلدی بولا تھا۔

تالیہ گیٹ کی طرف پشتے کئے کھڑی تھی جب  
وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اس کا لہجہ سرخ فرائی سے  
ہیٹ اور پیچھے کرتے سنہری ہال میاں سے دکھائی

ہے۔“ اس نے جواب دیے بغیر فون جیب میں ڈالا  
اور سینڈ فری کانوں میں لگاتے ہوئے قدم تیز کر  
دیے۔ صحافی مزید سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگے مگر وہ  
جلد ہی ان کے درمیان سے راستہ بناتا... آہستہ  
آہستہ بھاگتا آگے نکل گیا۔

اور ایسے میں اس کے ذہن میں ایک خیال  
گردش کرنے لگا تھا۔

معلوم نہیں عالم نامی اس انویسٹی گیٹر کا کیا  
مسئلہ ہوگا؟

بار بار ذہن بھٹک کے اس ہی کی طرف جا رہا  
تھا۔

☆ ☆ ☆

ایڈم کے چھوٹے سے گھر کا باغیچہ اتوار کی صبح  
پھولوں سے مہک رہا تھا۔ مرغی گھاس پر چونچ مار رہی  
تھی اور چوڑے چوں چوں کرتے اس کے پیچھے  
بھاگ رہے تھے۔ دیوار پہ لوہے کی پٹری لگی تھی جس کے  
باعث مٹی اب وہاں دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایڈم کی ماں  
برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھالی میں میدہ لیے  
بیڑے بنا رہی تھی۔ بارش ختم ہوئے گھنٹہ بھر ہونے کو  
آیا تھا اور موسم خوشگوار تھا۔

اطلاعی گھنٹی بجی تو ماں نے چونک کے سر اٹھایا۔  
بیڑے بناتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ سامنے لگے  
چھوٹے سے جنگلے نما گیٹ کے پار کھڑی لڑکی صاف  
دکھائی دیتی تھی۔ پاؤں کو چھو تا سرخ فرائی پہنے ہوئی  
بیک ڈالے، سر پہ ترچھا سفید ہیٹ رکھے ”وہ سنہرے  
بالوں والی لڑکی شناسما تھی۔

”سلام!“ سر کو خم دے کر سلام کیا تو ابو تھالی  
رکھ کے آنے سے تسخیر ہاتھوں کے ساتھ انھیں۔

”ہے...“ وہ رکیں۔ اس کا نام کیا تھا؟ ذہن میں  
گڈبڈسا ہوا رہا تھا۔ مگر وہ جلدی سے آگے آئیں اور مسکرا  
کے دروازہ کھولا۔

”میں ایڈم سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ ہانپکا کے  
بولی۔ ساتھ ہی نظروں سے ہانپے کا سناہ لیا۔ گھاس  
کے انعام پہ ماچس کی اہلی ہیسا تھا سا کمر تھا جس کی

دیتے تھے۔ ایڈم نے شرمندگی سے اپنے چھوٹے  
سے بانیچے کو دیکھا، پھر ہاتھوں سے شرٹ کی نادیہ  
فلٹیں درست کیں اور کنگھارتا ہوا قریب آیا۔  
”پتہ تالیہ!“

وہ اس کی طرف گھومی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔  
تالیہ نے سفید ہیٹ ترچھا کیا تو اس کا چہرہ پورا نظر  
آیا۔ اس چہرے پر صرف سادگی تھی۔  
”اندرو..... اندر آئیے۔“

وہ گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ یعنی سڑک پر۔  
ارد گرد چھوٹے گھروں کی قطار تھی اور لوگ آ جا رہے  
تھے۔ ایک لڑکی پرآم دھلیاتی آ رہی تھی۔ ایک فربہ  
مانگی عورت سبزی وغیرہ کے تھیلے اٹھائے سامنے جا  
رہی تھی۔ ایک بوڑھا جوڑا خوش گوار موسم کے باعث  
چہل قدمی کرنے نکلا ہوا تھا۔

”یہ عورت کبھی اس لڑکی جیسی ہوگی۔“ اس نے  
ایرو سے سامان اٹھائے چلتی عورت کی طرف اشارہ کیا  
تو ایڈم نے اس کی نکاہوں کے تعاقب میں پہلے اس  
مونی عورت کو دیکھا پھر اس نوجوان لڑکی کو۔ ”بھئی یہ  
اتنی پتلی ہوگی لیکن اپنی شادی کے تین چار سال بعد یہ  
ایسی ہوگئی ہوگی۔ تقریباً بیس کلو وزن بڑھا ہوگا جس کو  
یہ گھٹانے سکی ہوگی۔“

ایڈم غور سے اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا  
تھا۔ اپنے گھر پہ شرمندگی اپنا رخ حلیہ ’ساری فکریں  
ذہن سے محو ہونے لگیں۔

”جانتے ہو پتلے لوگ مونے کیوں ہو جاتے  
ہیں؟“ تالیہ گردن مونے پتلی لڑکی کو پرآم دھلیاتے دیکھ  
رہی تھی۔

”کیونکہ وہ بہت کھاتے ہیں۔“  
”مگر کتنا کھاتے ہیں؟ پتا ہے ایک تحقیق ہوگی  
اس بارے میں کہ پتلے لوگوں اور مونے لوگوں کی  
روزانہ کی خوراک میں کتنا فرق ہے؟“  
وہ ذہم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہی تھی۔

”مونے اور پتلے لوگوں کی سال بھر کی خوراک  
کا موازنہ کیا گیا تو معلوم ہے ’شاہی مورخ‘ ہر روز

مونے لوگ پتلے لوگوں سے کتنا زیادہ کھاتے ہیں؟“  
اس نے چہرہ موز کر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔  
”صرف ایک نوالہ زیادہ!“

ایڈم نے بے یقینی سے ایہہ اٹھائے۔  
”ایک نوالہ؟ صرف ایک نوالے سے کون مونے  
ہوتا ہے؟“

”بالکل۔ یہ عورت بھی یہی سمجھتی ہوگی کہ روز کا  
ایک نوالہ زائد کھانے سے میں مونے کہاں ہو سکتی  
ہوں۔ مگر ہر روز کا ایک زائد نوالہ جو اندر جاتا ہے وہ  
جمع ہوتا جاتا ہے اور سال بھر میں چار پانچ کلو وزن  
بڑھاتا ہے۔ شادی کے چوتھے پانچویں سال تک  
لڑکیاں پندرہ بیس کلو بڑھا کر مونی مرغیوں جیسی بن  
جاتی ہیں کیونکہ ان اب کو لگتا ہے کہ ایک نوالہ.....  
ذرا سی چینیٹک سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

پھر وہ پوری اس کی طرف گھومی اور اس  
مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”لیکن فرق پڑتا ہے۔ روز کے چھوٹے  
چھوٹے جھوٹ اور چھوٹی چھوٹی خیانتیں جمع ہو کر  
بہت بڑا ڈھیر لگا دیتی ہیں اور ان سے جان چھڑانا اتنا  
ہی مشکل ہوتا ہے جیسے بڑھا ہوا وزن کم کرنا۔ ان  
دونوں کاموں کے لیے بہت سادہ اور پرہیز کرنا ہوتا  
ہے۔ پلیٹ میں پیش کی گئی نعمتوں کو دیکھ کے بھی انکار  
میں سر ہلانا پڑتا ہے۔“

”آپ نے فیصلہ کر لیا ہے؟“

”ہاں..... میری کار میں کھدائی کا سامان پڑا  
ہے۔ میرے ساتھ ملا کہ چلو۔ ہم اپنا خزانہ کھود کے  
نکالیں گے اور پھر ہم فوراً ڈسٹرکٹ آفیسر کو خبر دیں  
گے۔ ہم اسے پوری ایمانداری سے سرکار کے حوالے  
کر دیں گے۔“

ایڈم نے اسے پتلیاں سکڑ کے مشکوک نظروں  
سے اسے دیکھا۔ ”میں کیسے یقین کروں کہ آپ خزانہ  
دیکھتے ہی کدال میرے سر پہ نہیں دے ماریں گی؟ اور  
کھودے ہوئے گڑھے میں میری لاش دفن کر کے  
سارے ثبوت نہیں مٹا دیں گی؟“



”ہاں اور جب ہم سرکار سے خزانے کی ذیل کریں گے تو ان سے عہد لیں گے کہ انعام خزانے کا پرسنٹ اتج ہونا چاہیے۔ کروڑوں کے خزانے کا معمولی حصہ بھی بہت ہی ہوگا۔ حکومت بہت آرام سے چند نوادرات ہمیں دے دے گی جس کو میں بھولہ پردوشن کے بعد کروڑوں میں بیچوں گی۔ ہاں ہم اس رقم سے بہت امیر نہیں ہو جائیں گے مگر ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اتنی رقم کافی ہے اور پھر میرے پاس ملاکہ سے لایا گیا قیمتی زیور بھی ہے اور وان فاتح مجھے لی این میں اعلیٰ پائے کی جاب بھی دلوا دیں گے۔ یہ بھی کم نہیں ہے۔“

”اور میں سمجھا چے تالیہ اپنے سارے خواب بھلا کر درویشانہ زندگی گزارنے جا رہی ہیں مگر آپ نہیں بدلیں گی۔“ وہ مصنوعی حلقی سے بولا تو تالیہ نے کندھے اچکائے۔

”خوابوں پر شہزادی تالیہ کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی۔ گستاخ مورخ۔“ پھر اس کے دائیں ہاتھ کو دیکھا جسے ایڈم نے سرعت سے پیچھے کر لیا۔ ”میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں، آپ یہیں رکھیں۔“

وہ جیسے ہی اندر آیا ایبو پیچھے پیچھے چلتی آئیں۔ ”تم دونوں کسی خزانے کی بات کر رہے تھے ایڈم مجھے بتاؤ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ایڈم بن محمد کو زمین میں چھپے خزانے کا راز لے والا ہے، ماں۔ تایا کی دعا قبول ہونے والی ہے۔“ وہ الماری میں ہنگر زادہ کر کرتے ہوئے غلت میں ہانپنے لگا۔ چہرہ جوش سے تھمتار ہاتھا۔

چوکھٹ میں کھڑی ایبو نے گہری سانس لی۔ ”اور اس روز تم دنیا کے بادشاہوں سے زیادہ طاقتور بن جاؤ گے۔ یہ بات بھی اس خواب میں شامل تھی۔ ایڈم کے ہاتھ رکے۔ وہ ٹھٹکا۔ بے اعتبار کمبوڈوڈرین کی لاش اور وہ غار یاد آیا جو سونے سے بھرا تھا۔

(ایک خزانے کا راز اسے پہلے بھی ملا تھا مگر اس نے کسی مقام پہ خود کو بادشاہ سے زیادہ طاقتور تصور نہیں

تالیہ نے تھکی ہوئی سانس بھری۔ ”اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو تمہیں ساتھ کیوں لے کر جاتی؟ اسکے ہی سارا خزانہ نکال کے غائب ہو جاتی۔ تم نے پولیس کو نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”واقعی مجھے ساتھ لے کر جا کیوں رہی ہیں آپ؟“

”تاکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ تالیہ بنت مراد اپنے باپ کی جیسی نہیں ہے۔ وہ اس خزانے کو نہیں لوٹے گی جو اس کے ملک کے لوگوں کی امانت ہے۔ اور میرے خواب کے مطابق ہم دونوں اکٹھا خزانہ نکالنے کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک خزانہ ہم نے پہلے بھی ایک ساتھ ڈھونڈا تھا۔ جیسے تم نے اس خزانے کی حفاظت کی تھی آج مجھے اس کی کرنے دو۔“

ایڈم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ماتھے کے ٹیل غائب ہو گئے۔ وہ پورے دل سے مسکرایا۔

”آپ واقعی بدلنا چاہتی ہیں؟“

”ہاں مجھے اچھائی کی طاقت پر اتنا بھروسہ تھا تو ہے ہی۔“ بیٹ والی لڑکی مسکراتی تھی۔ ایڈم کا دل خوشی سے بھر گیا۔

”لیکن آپ کے امیر ہونے کا خواب ادھر ادھر جائے گا۔“

تالیہ مراد نے بیٹ ترچھی کی اور معنی خیزی سے مسکرائی۔ ”کس نے کہا؟“

ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ”ایک منٹ..... آپ نے ابھی کہا کہ آپ خزانے کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔“

”ہرگز نہیں... میں نے یہ کہا کہ ہم ڈسٹرکٹ آفیسر کو اطلاع دیں گے اور خزانہ حکومت کے حوالے کردیں گے مگر یونوواٹ ایڈم۔ تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ تم بہت سیدھے ہو۔ میں نہیں ہوں۔ میں نے فریڈرک ووا ایکٹ پڑھا ہے۔ اس کے مطابق حکومت کو خزانہ ڈھونڈنے والوں کو انعام بھی دینا ہوتا ہے۔“

”انعام؟“ ایڈم کا منہ کھل گیا۔





آسان ہو۔ اس کے سارے دوست نے ہیرے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ ٹاپس بلیو ڈائمنڈ کے تھے اور ڈیزائنرز جیولری معلوم ہوتے تھے یقیناً تالیہ کو اس کے کسی چاہنے والے نے دیے ہوں گے۔

”اپنی والدہ کے ڈائمنڈز کو میں اتونٹی میں جڑوانا چاہتا ہوں۔ دراصل میری شادی ہو رہی ہے گا وہ سکران کے بیٹا رہا تھا۔ ساتھ ہی جیب سے ایک باکس نکالا اور اسے کھولا۔ اس کے اندر وہ دونوں ہیرے ایک سونے کے لاکٹ کے ساتھ پڑے دکھائی دیتے تھے۔ لاکٹ پرانا تھا اور ایسا لگتا تھا اندر سے ہیرے اتارے گئے ہیں۔

”میں نے ایک جیولر سے ان کو اتروایا مگر اس نے اتونٹی کے جو ڈیزائن دکھائے وہ مجھے پسند نہیں آئے۔ میں اسے آپ کے پاس لے آیا۔“

”شیدر سر۔۔۔ آپ کے ذہن میں کوئی ڈیزائن ہے؟“

اس نے فوراً باکس قریب کیا اور فوٹو میز سے ایک ہیرا اٹھا کے دیکھا۔ اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

”میں یہ ڈیزائن چاہ رہا تھا۔ میری مہلتیں کو یہ پسند ہے مگر سر براؤز دینا ہے تو اس لیے۔“ وہ موبائل پر ایک ڈیزائن دکھانے لگا۔

”آپ کے پاس رسید ہے نا اس کی؟ دراصل سسٹم ایسا ہے کہ۔۔۔“ فیجر وضاحت دینے لگا۔ بظاہر شک کرنے کی بجائے جنتی بھی مگر وہ مجبور تھا۔

”آف کورس ہے۔“ اس نے جیب سے فوراً کانڈیکٹل کے دکھائے۔ ”والدہ نے قریباً پانچ برس پہلے یہ لاکٹ بنوایا تھا۔ ان کی دقات کے بعد سے ایسی ہی پڑا ہے۔“ اب دورنی رٹائی کہانی سنار ہاتھا۔

”بہت قیمتی ہیرا ہے یہ۔“ فیجر متاثر کن نظروں سے ہیرے کی حالت پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے احتیاط سے دونوں ہیروں کو فوٹی میں ڈالا۔

”میں ان کو چیک کر لوں۔ پھر بتاتا ہوں کہ کیا

کرنا ہے۔“ خوش اخلاقی سے کہتا فیجر ہیروں کو پہلے شوکیس کے سرے تک آیا جہاں نیچے چند مٹینیں رکھی تھیں۔ اس نے مائیکرو اسکوپ کی طرف کی مٹین میں ایک ہیرا رکھا اور آنکھ مقررہ جگہ پر لگا کر اسے ہر کھتے لگا۔

اسٹور کے قیمتی ہیروں اور سونے کی ہمک سمج کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اسے سی کے ٹھکانے اور خنک ماحول میں وہ خود کو بہت آرام دہ محسوس کر رہا تھا جب فیجر واپس اس تک آیا۔

”آپ کے ہیرے بالکل اصلی ہیں۔ اچھا اب میں آپ کو چند فریش ڈیزائن دکھا دیتا ہوں جو آپ کی خوش قسمت وائف کو بہت پسند آئیں گے۔“ فیجر خوش دلی سے چند کمیز نکال لایا۔ پھر ایک ایک اتونٹی نکال کے دکھائی۔ اپنی چرب زبانی سے وہ ہر اتونٹی کے ڈیزائن کی شان میں غلابے مار رہا تھا۔

”سمج کچھ دیر ان کو دیکھتا رہا۔ یوں ظاہر کیا جیسے اسے ڈیزائن پسند نہ آ رہے ہوں۔

”شاید ہیرے بہت بڑے ہیں۔ ان کو بچ کے میں چھوٹے ہیرے خرید کے اگر انہیں یوں بنوایں تو۔۔۔“ وہ ایک ڈیزائن پر انگلی رکھ کے بولا تو جیولر گہری سانس لیتے ہوئے پیچھے ہوا۔

”نو پھٹس جناب۔“ مجھے آپ کے چوری کے ہیرے نہیں خریدنے۔“ جیولر کا لہجہ ایک دم روکھا ہوئے سمج نے چونک کے اسے دیکھا جو سمج کے پیچھے کی دیکھ رہا تھا۔

”سمج ایک دم گھوما۔ کرسی بھی ساتھ ہی گھومی۔ دکان کے دروازے سے تین پولیس آفیسرز داخل ہو رہے تھے۔

”ایک منٹ۔ میرے ہیرے چوری کے نہیں ہیں۔“ اس نے بوکھلا کر فیجر کو پکارا۔ ”آپ نے پولیس کیوں بلائی ہے؟“

”کہانی اچھی گھڑی آپ نے جناب۔“ جیولر رکھائی سے کہتا اٹھا اور اسے کمیز پہنے لگا۔ پولیس والے اس کے گرد گھیرائے گھڑے ہوئے۔

پوچھ رہے تھے جتنے ان پریشان ہو گیا تھا۔

”اور میں آپ کی کہانی میں آجھی گیا تھا لیکن میں نے ہیرا دل کو چپ کر لیا۔ جس مناسبت آپ نے چلی رسیدیں بنوائی ہیں، اس کے پاس۔ یہ دانی تحقیق نہیں ہوئی ورنہ تھوڑے دنوں میں ہیرا دل کو ہیرا دل کی کٹی ہے جس میں ان کا سر نیچا ہیرا سر لکھا ہے۔ یہ آپ کی واحد کٹے نہیں ہیں جناب۔ یہ ہیرے Joyalukkas کے ہیرے ہیں۔ ہیرے کے پاس سے ہمارے گھرے ہیں اور یہ ایک سال پہلے ایک سنگاپور میں قانون کے پاس سے چوری کیے گئے تھے اور ان کا حقیقت نمبر پولیس نے تمام ڈائمنڈ ڈیلرز کو بھیج رکھا تھا۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈیزائنرز جیولری جب بھی چوری ہوتی ہے، اس کے مالکان اس کا لیڈر اسکر ہینڈ نمبر پولیس کو دے دیتے ہیں۔“ وہ ٹھک ٹھک انگوٹھوں کے ڈبوں کے ڈھکن بند کر رہا تھا اور سچے کے قدموں تلے زمین سرک رہی تھی۔

”یہ میں نے نہیں چرائے۔ مجھے میری بیوی نے دیے تھے۔“

”یہ ہیرے صرف چوری شدہ نہیں ہیں مسٹر۔“ افسر نے اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر ہتھکڑی لگاتے کہا۔ ”یہ ہیرے ایک ٹل کے کیس سے چرائے گئے تھے۔ اب تم تھانے چل کے ہمیں یہ بتاؤ گے کہ اس ٹل سے تمہارا کیاعلق ہے؟“

”اف!“ سچ نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

وہ اسے جان بوجھ کے ہاتھ روزنک لائی تھی کیونکہ وہاں کیمرے نہیں لگے تھے۔ اس نے جان بوجھ کے اس وقت صرف موٹے موٹے ٹاپس پہن رکھے تھے تاکہ وہ ان کے لالچ میں آجائے۔ اس کا وہ ڈرنا وہ غصہ کرنا وہ سب۔ سب اداکاری تھا۔ اس نے اسے بہت برا پھنسا تھا۔

اف! اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

ملا کہ شہر میں سن باؤ کا گھر ویسا ہی تھا جیسا وہ ہفتہ بھر پہلے رات کو چھوڑ کے گئے تھے۔ وہی سرخ

تھوڑی سی سیٹی کتوال۔ سیٹی تھوڑی سی سیٹی اور سیٹی لال انگوٹھوں والا کت۔ جسے بھی وہی سیٹی تھوڑی سیٹی کے کھڑا تھا۔ اس کی پتھر کی آنکھیں ہتھکڑی سے ماسے والی دیوار کے پتھر کی تھیں۔

اس حالت ان کو کھانی کرتے کٹی گھٹنے پر تھے تھے۔ جسے کے قریب ان کی آنکھیں آگڑی پڑتی تھیں اور گڑی جگہ کھاتی تھیں۔ شام ہو چکی تھی اور وہ دو دوں مٹی سے لائے پتروں کے ساتھ دستے جڑے تھے۔ بال پلاسٹک کیپ میں ڈھانکے، کدالیں پتھر سے منہ ہونے میں لگے تھے۔

”جب تک ہمیں یہ جگہ کھو نہ جائے گی۔“ ایڈم سانس لینے کو رکھا تو شکایتی انداز میں بولا۔ اس کا چہرہ مٹی سے لٹکا ہوا کپڑے کی میسے ہو رہے تھے۔

تالیہ نے کدال کا پھل زمین میں بگاڑا اور اس پر دونوں ہاتھ جھاکے ذرا اوپر کو سستانے لگی۔

”اچھا! اسے کام کرنا تھا۔ ورنہ سارے بازار کو اٹھا دیتی جاتی کہ یہ مال کھانی ہو رہی ہے۔“

”آؤ اس جواب بھی مٹی بول گئی۔“

”اسی لیے آتے وقت اس پاس بٹا دیا تھا کہ جی کرائے دار ہوں اور گھر کی رتی ماڈلنگ کروا رہی ہوں۔ بے فکر رہو۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔“ اس نے پھر سے کدال اٹھائی اور زمین کھودنے لگی۔

چھ سو سال نے اس جگہ کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ مجسمہ ویسا نہ تھا جیسا اس نے بنایا تھا۔ جگہ جگہ سے وہ ٹوٹ ہوا لٹکا تھا گویا بعد میں مرمت کی گئی ہو۔ مٹی بھی کٹی دفعہ بنایا گیا تھا گھر زمین پرانی تھی۔

جیسے آسمان پرانا تھا۔ جیسے ملا کہ کا بوڑھا سمندر پرانا تھا۔

بس ہوا میں cesium کی ملاوٹ تھی۔ کدال کی ہر ضرب کے ساتھ مٹی نکلتی جا رہی تھی

اور وہ اپنے مطلوبہ صندوق کے قریب پہنچتے جا رہے تھے۔ مٹی پہ نظریں جمائے، کدال اس میں مارتے،

اس کے ذہن کے پردے پر ایک سرمئی شام اترنے لگی۔





جیسے پلٹ کے اسے دیکھا۔

”اور اگر مجھے آپ کے قریب رہنا ہو تو میں کیا کروں؟“

”سرمئی شام ابھی تک روشن تھی اور سن باؤ کا گھر خاموش تھا۔ ایسے میں آدھے بنے جسے کے ساتھ وہ دونوں یوں کھڑے تھے کہ قہر جیسے کود کچھ رہا تھا اور وہ اسے۔“

”تم کئی دفعہ کہہ چکی ہو کہ تم یہاں سے دور چلی جاؤ گی۔ امریکہ وغیرہ۔“

”چلی تو میں جاؤں گی۔ اپنی کچھ چیزیں لے کر۔“ اس نے نظریں جھکا کے جسے کے قدموں کو دیکھا جہاں زمین برابر تھی مگر منوں مٹی تھے اس کا خزانہ چھپا تھا۔ ”لیکن اگر بھی ارادہ بدل دوں اور آپ کے ساتھ رہنا چاہوں تو کیسے رہوں؟“

وہ آہستہ سے اس کی طرف گھوما۔ ایسے کہ چتلیاں سیٹھریں اس کی بات پہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

”میرے آفس میں جا کر لیٹا۔“

”مگر آپ کو تو میری ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”ہاں وہ تو نہیں ہے، لیکن میری زندگی تالیہ، صرف کام کے گرد گھومتی ہے۔ اگر کہیں میرے قریب رہتا ہے تو تمہیں میرے آفس میں جا کر کرنا پڑے گی۔“ پھر سے کندھے اچکائے۔ سدا کا بے نیاز اور مطمئن آدمی۔

”آپ کے آفس میں مجھے کون سی جا بٹل سکتی ہے؟“ پھر پھر کے بولی۔ ”آپ کے آفس میں کون سی جا بٹل اعلیٰ ترین ہے اور کون سی ادنیٰ ترین؟“

”اعلیٰ ترین تو ممبرز پارلیمنٹ ہوتے ہیں۔“

”وہ تو میں بن نہیں سکتی۔ ادنیٰ ترین کون ہوتے ہیں؟“

”سب سے ادنیٰ اور معمولی جا بٹل سیکریٹری درکار کی ہوتی ہے مگر نہیں، وہ آفس کے باہر ہوتے ہیں۔ پھر وہ گمیا لفٹ والا آدمی۔ انہوں۔ وہ بھی ہمارے فلوور پہ نہیں ہوتا۔“ وہ ٹھوڑی کھباتے ہوئے

سوچنے لگا۔ ”ہاں۔ سب سے کم فلوور والے پارکس اور یا باڈی مین سی جوتے پہن۔ اور سب سے اعلیٰ جا بٹل پارلیمنٹ جمینٹ کی ہوتی ہے وہاں جوتے پہناتے اور دانتوں کی دھت سے وہاں تعینات ہوتے ہیں۔ لیکن سوشل سینیٹ یا نیم کا میجر سے تو میں۔ سینیٹ یا سوشل سینیٹ کا بیڈ، مگر اصل یہ لوگ کٹ مکتے ہوتے ہیں۔“

”تو سب سے اعلیٰ جا بٹل مکتے کی ہوتی ہے۔“ اس کی آنکھیں چمکیں۔

”بالکل۔“ پھر اس نے دیکھ کے مسکرایا۔ ”میرے اہم سے وعدہ ہے۔ تم جب بھی مجھ سے جا بٹل مانتے آؤ گی، میں تمہیں اپنا کٹ مکتے ہوں۔“ اس عہد سے کچھ بڑا بھگت ہو وہ کٹ مکتے کا عہد وہی ہو گا۔

”اور اگر شہرت اور طاقت کی چکا چوند میں آپ اپنا وعدہ بھول گئے تو؟“ اسے دہرا رہا ہوا۔

”بھول بھی گیا تو تم اتنی قابل ہو کہ کسی بھی سیاسی جماعت میں بہت جلد میرٹ اور محنت سے کٹ مکتے میں جاؤ۔“ پھر وہ پھر۔ ”لیکن یہاں کھڑا۔“

”راہبہ نہیں کسی کو اچھے نہیں لگتے۔“ تیسرے کے تالیہ کے ابرو اٹھنے سے اس نے بولے۔

”راہبہ نہیں کون؟“

”روٹی بادشاہ کوئیس کا سلطان سرتو۔ ویسے تو وہ کوئیس کے بیٹے اور بیٹی الیگزینڈرا کا صاحب گھر اور حور تھا، لیکن بادشاہ کا اصل ہم راز اور مشیر بھی تھا۔ بادشاہ ہر فیصلہ اپنے اسی روحانی مشوا سے پوچھ کے کرتا تھا۔ الیگزینڈرا اور راہبہ نہیں، ان دونوں کے غلط مشوروں سے کوئیس کو نقصان پہنچا تھا۔ دونوں سے عوام شدید نفرت کرتے تھے۔ آخر میں راہبہ نہیں کو ایک دوسرے شہزادے نے دعوت کے پرانے گھر بلا کے قتل کر دیا تھا۔“

الفاظ کی سنجائی نے سرخ محن کو اداس کر دیا۔

”عوام سلطان سازوں سے اچھی نفرت کیوں کرتے ہیں؟“

”کیونکہ وہ اپنے لیڈر کو اپنے علاوہ کسی کی خواہش پہ چلنا نہیں دیکھ سکتے۔ آزاد لیڈر کسی سلطان



ایلم اور وہ خزانے کے قریب پہنچے تھے۔  
اس کا فون بیج رہا تھا۔ تالیہ نے کدال رکنی اور فون  
جیب سے نکالا۔ دوستانہ اشارے ہوئے پیغام دیکھا۔  
پھر مسکرا دی اور فون واپس رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" ایلم نے زمین کھودتے ہوئے  
تشویش سے سہاٹا۔

"میرا ایس۔۔۔۔۔ سچ۔۔۔۔۔ میرے بچے پا  
تھا۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ اسے پولیس پکڑ کے  
لے گئی ہے۔"

"اور آپ تو اتنی معصوم ہیں کہ اس میں آپ کا  
ہاتھ ہی نہیں ہوگا۔"

"ہاتھ نہیں، دماغ ہے۔ دماغ۔" مسکراتے  
ہوئے دوستانہ چہ چاہتے اس نے واپس کدال اٹھالی۔

"میرا اور داتن کا ایک چور دوست ہے آصف۔  
اس نے مجھے ایسی ڈیزائنز چوری کی بندوبست کر کے  
دیا جو قتل کے کیس سے تعلق رکھتی تھی اور بیچنے والے  
نے کوڑیوں کے مول بیچ کے جان چھڑائی تھی۔ سچ  
نے وہ ہیرے مجھ سے لیے اور انہیں بیچنے کی کوشش  
کرتے پکڑا گیا۔ پوچھو کیسے؟"

"ان ہیروں سے بھینا laser  
inscription کی گئی ہوگی جو کہ سرٹیفائیڈ  
ڈائمنڈز پہ ہوتی ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ تمہیں کیسے پتا؟"

"کیونکہ میں کتابیں پڑھتا ہوں۔" اس نے  
زور سے کدال کی ضرب لگائی۔ بالآخر لوہے کے  
صندوق کا کنارہ نظر آ رہا تھا۔

"یا اللہ!" وہ دونوں گڑھے میں اترے اور  
تیزی سے مٹی ہٹانے لگے۔ کیڑے، بودوں کی  
جزیرے، پتھر اور یہ تاریں۔۔۔۔۔ جگہ جگہ سے نکلتی تاریں  
بہت رکاوٹ ڈال رہی تھیں مگر جلد ہی وہ مٹی کم کرتے  
گئے، یہاں تک کہ صندوق کی اوپری سطح واضح ہوئی۔  
لوہا یوں لگتا تھا جیسے گل گیا ہو۔ زنگ آلود۔۔۔۔۔ بوسیدہ  
لوہا۔۔۔۔۔ جس کے درمیان۔۔۔۔۔ بڑا سا ڈکاف تھا اور  
مٹی بھری تھی۔

سادہ، کسی مشین کی خواہش پہ پلٹنا بھی نہیں ہے۔ وہ  
اصولوں پہ پلٹنا ہے اور صرف درست مشورہ قبول کرتا  
ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ امام بھی اپنے لپڈ رکھ  
تھوڑا وارنٹس ٹھہراتے۔ وہ راسخ دشمن جیسے سلطان  
سازوں اور ایکزیگزٹرا بھیسی طاقت اندیش بیویوں  
سے نفرت کرتے ہیں۔ لپڈ راز ختم ہیرے درہتا ہے۔"

وہ دونوں جیسے کے ساتھ صحن میں گھڑے دیکھی  
آواز میں بات کر رہے تھے۔

"اور آخر میں سارے طاقتور سلطان سارا قتل  
کیوں ہو جاتے ہیں؟"

"کیونکہ اگر وہ بادشاہ کے ساتھ وفادار نہ رہیں  
تو بادشاہ کو مار کے تخت پہ قبضہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر  
وفادار رہیں تو بادشاہ کا ان سے اعتبار کوئی نہیں ہوتا  
سکتا۔ کوئی سازش، کوئی چال ان کا مقام نہیں کھٹا سکتی تو  
ماسد رقیب ان کی جان لے لیتے ہیں۔ سلطان ساز  
بننا آسان نہیں ہے۔ اور کوکہ میں تمہیں جواب دینے کا  
وعدہ کرتا ہوں، لیکن میں دل سے کبھی نہیں چاہوں گا  
کہ تم میرے آفس میں میرے ساتھ اس طرح کام  
کرو۔"

"کیوں؟" وہ چوکی۔

"کیونکہ۔۔۔۔۔ وہ چند قدم آگے بڑھ آیا اور مال  
اس کی آنکھوں میں دیکھا۔" یہ ایسی دلدل ہے  
جس میں کچڑ ہی کچڑ ہے۔ یہ تمہیں اپنے اندر دھنسا  
لے گی۔ اور اگر دھنسانہ سکی تو لباس داغ دار ضرور کر  
دے گی۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ صرف میرے  
ساتھ رہنے کے لیے تم اس دلدل میں قدم رکھو۔"

وہ فکر مند لگتا تھا۔ تالیہ مسکرا دی۔

"جیسے آپ کو میری ضرورت نہیں، ویسے ہی  
مجھے بھی آپ کی ضرورت نہیں۔ میں تو آپ کا امتحان  
لے رہی تھی۔" پھر شہزادی نے گھمنڈی انداز میں سر  
جھکا اور بے نیازی سے واپس کارے کی طرف پلٹ  
گئی۔

فون کی گھنٹی نے اسے ہٹا دیا تو وہ سال میں  
واپس آئی۔

تالیہ کا ہاتھ اٹھکا۔ یہ شکاف کیوں ہے؟  
 مگر نہیں۔۔۔ اس نے سارے واہموں کو ذہن  
 سے جھٹکا اور ہتھیلیوں سے مٹی ہٹانے لگی۔۔۔ ان  
 دونوں کی زبانیں ساکت تھیں اور ہاتھ تیز تیز کام کر  
 رہے تھے۔

یہاں تک کہ صندوق کی ساری مٹی انہوں نے  
 باہر نکال دی۔۔۔۔۔

اور۔۔۔ دو صندوق خالی تھا۔ خزانہ وہاں نہیں تھا۔  
 تالیہ کا مٹی سے اٹا چہرہ ساکت ہو گیا۔ ایڈم بھی  
 شل رہ گیا۔

وہ محض اتنا کہتا تھا کہ یوں لگتا تھا، برسوں  
 سے کسی نے ایک اینٹ بھی نہیں ہلائی تھی۔ مجسمہ بھی  
 اپنی جگہ پر موجود تھا۔ تو پھر خزانہ کہاں گیا؟

صندوق اتنا مضبوطی سے فٹ کیا گیا تھا کہ  
 خزانہ نکالنے والے نے اس کو دیے ہی چھوڑ دیا اور  
 صرف اس کے ڈھکن میں شکاف کر کے ساری  
 چیزیں نکال لی تھیں۔ مگر کس نے اور کب؟  
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔ جے تالیہ یہ ناممکن ہے!“

اب حالت یہ تھی کہ خزن کے درمیان میں گڑھا  
 کھدایا ہوا تھا اور اس کے دبانے پر وہ دونوں مٹی مٹی  
 ہوئے پھر لٹکائے بیٹھے تھے۔  
 ”ہمارا خزانہ کہاں گیا ایڈم؟“ وہ سرگوشی میں  
 بولی۔ ششدر نظریں ٹوٹے ہوئے صندوق پر جمی تھیں۔  
 ”کسی نے ہم سے پہلے خزانہ نکال لیا ہے۔ مگر  
 کس نے؟“

”نوب، ہمیں حکومت کا انعام نہیں ملے گا۔“  
 ”اور میری شادی کے پیسے بھی اکٹھے نہیں ہو  
 پائیں گے۔“

”یعنی ہم وہیں پہ آگئے ہیں جہاں سے شروع  
 ہوئے تھے۔ ہمارا خزانہ چوری ہو گیا ہے۔“ وہ کھوئی  
 کھوئی سی بولی۔ ”اور ہم پھر خالی ہاتھ ہیں۔“

وہ دونوں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ شل۔  
 ماؤف دماغ لپے۔ سب کچھ جیسے تم ہو گیا تھا۔  
 ”ہم نے کیوں سوچ لیا تھا ہے تالیہ کہ چھ سو سال

گزرنے کے بعد بھی خزانہ اپنی جگہ پر موجود ہوگا۔“  
 وہ ابھی تک بنا پلٹیں جھکے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”پانچ سو ستاون سال ایڈم۔“

اور ان دونوں میں سے کوئی نہ ہنسا۔ وہ چپ  
 چاپ گم صم سے بیٹھے رہے۔

من باؤ وانگ لی کا مجسمہ اپنی پتھر لی آنکھوں  
 میں صدیوں پرانے راز چھپائے خاموشی سے دور افق  
 کو دیکھتا رہا۔

صرف وہی جانتا تھا کہ خزانہ کس نے نکالا تھا۔  
 مگر بند لہار کی بیٹی نے اس کا پتھر چلا چہرہ  
 بناتے وقت اندر زبان۔ نہیں رکھی تھی جس کو بلا کے  
 وہ انہیں حقیقت بتا سکتا۔

اس کی صرف آنکھیں تھیں جن میں سارے سداوت  
 پتھر ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

سوموار کی صبح کے ایل کے دفتروں میں کام  
 شروع ہو چکا تھا۔ منڈے مارنٹ کسی کو پسند نہیں  
 تھی مگر بھائیوں روکتے اتوار کے۔ بیٹا سون کو  
 بھلانے کی سعی کرتے ملازم کام میں لگے تھے۔ پترا  
 ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے اس قدر یہ بار۔ سن سینٹر کا پتھر بھی  
 معمول کی مصروفیات کا شکار دکھائی دیتا تھا۔

وان قاح کے آفس کے سامنے بے چھوٹے  
 سے سٹک ایریا میں تالیہ مراد پتھی نظر آتی تھی۔ بالوں  
 کا جوڑا بٹائے، وہ بجوری اسکرٹ بلاؤز پر سفید کوسٹ  
 پہنے کوئی ایگزیکٹو لگ رہی تھی۔

وہ ابھی ابھی آکے بیٹھی تھی اور اسے دیکھتے ہی  
 قاح کا سیکرٹری عمن فوراً اُپڑا آیا تھا۔

”ہیم آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ میں قاح  
 صاحب سے آپ کے آپائنٹمنٹ لیٹر کا پوچھ کے آ رہی  
 ہوں۔“ وہ شائستگی سے بولا تو تالیہ نے سب سے تیزی  
 سے گردن ہٹا دی اور ابھر ابھر دیکھنے لگی۔

عمن چلا گیا تو اس کا فون بجلا۔ اس نے سر ہانکی  
 نکال کے اسکرین روشن کیا۔

”میں نے ساری جگہ کھود کے دیکھا لیکن کچھ نہیں





فری اور ان کے ہلنے لب....  
 سڑک کنارے اخبار کھولے بیٹھے ممبر لوگ....  
 خواب روز روشن کی طرح واضح تھا۔  
 ایسے میں وہ سڑک عبور کرتی ہے  
 اور اندر ایک گلی کی طرف مڑ جاتی ہے۔  
 پھر تین سوڑ مزید مڑتی ہے....  
 گلی آگے جا کے تنگ ہونے لگتی ہے....  
 اس کی دیواریں نیلی اینٹوں کی بنی ہیں....  
 وہ قدم بڑھاتے ہوئے اینٹوں پہ ہاتھ پھیر  
 رہی ہے....

”دروازہ کھلتے ہی یہ ہر گزرتے پل بھاری  
 ہوتی جائے گی یہاں تک کہ تم اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکو  
 گے۔ اور آخر کار تم اس کو گردن سے فوج پھینکو گے۔“  
 ”تقریباً کتنی دیر بعد؟“ اس نے دہرایا۔ ”کتنا  
 وقت ہوگا میرے پاس؟“

”تقریباً ایک پوری رات۔ اس سے زیادہ  
 نہیں۔ کیوں؟ تم اس ایک رات میں کیا کرنا چاہتے  
 ہو؟“ مراد نے غور سے اسے دیکھا۔

”ایک رات تو بہت طویل عرصہ ہے رجبہ۔  
 یہاں تو ایک لمحے میں دنیا بدل جاتی ہے۔ زمانہ پلٹ  
 جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا تم مجھے نہیں جانتے۔ اور۔“  
 نرسی دھکیل کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تاثرات  
 پتھر جیسے بھرے تھے۔

”اور مجھے معلوم ہے کہ میں یہ کیوں کر رہا  
 ہوں۔“  
 ”کیوں کر رہے ہو؟“ مراد رجبہ نے گردن اٹھا  
 کے استہزاء سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر جادو کا توڑ ہوتا  
 ہے۔ یادداشت کا کھودنا مستقل نہیں ہوگا۔ اس کا  
 کوئی حل بھی ہوگا۔“

مراد رجبہ لمحے بھر کو رینگ رہ گیا۔ گردن میں  
 تھوک نچکنے سے کھنسی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔  
 ”تمہاری یادداشت واپس نہیں آئے گی غلام  
 قاسم۔“

قاسم جواباً کھڑے مسکرایا۔  
 ”غلط۔ تالیہ کی یادداشت کھڑوں کی صورت  
 میں واپس آئی تھی۔ اسے قدیم ملاک میں اپنے بھجن  
 چد لمحے کے لیے قدیم ملاک کی اس شام میں  
 واپس جاتے ہیں جب مراد رجبہ کے سامنے بیٹھے غلام  
 قاسم نے وہ بے رنگ بے ذائقہ شروب پی کے چابی



کے کچھ حصے یاد ہیں۔ مجھے بھی قدیم ماکہ میں گزرے یہ چار ماہ یاد آجائیں گے مگر سوال یہ ہے کہ کیسے؟

مراد راجہ کے ماتھے پہ تل پڑے۔

”تم سمجھتے ہو کہ یہ آسان ہے؟“

”وان فاتح نے زندگی میں آسان کام کبھی نہیں کئے کیونکہ وہ سب کر لیتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ وہ کیا مشکل کام ہے جسے میں کروں تو میری یادداشت واپس آجائے گی؟“

راجہ چند لمحے لب بھینچے اسے کھورتا رہا۔

”میں تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔“

”تمہارے پیارے میں تاریخ کی کتابوں میں ایک حکایت پڑھی تھی میں نے۔“ فاتح نے ہتھیلیاں میز پر رکھیں اور جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ایک لڑائی کے دوران تمہارے مد مقابل شخص کا تلوار والا ہاتھ کٹ گیا۔ ہاتھ بھی گیا اور تلوار بھی۔ تو تم نے اپنی تلوار پھینک دی اور اپنا ایک ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے نہتے وہ لڑائی لڑی اور اسے مار گرایا۔ یہ غیرت مند مردوں کا طریقہ ہوتا ہے راجہ! وہ مقابلہ برابری کی سطح پہ کرتے ہیں۔ مجھے نہتا کر کے ہرانے میں کیا مزا ہے؟“ وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”یا شاید تمہیں ڈر ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا؟“

”تم کچھ بھی کر لو۔ میری بیٹی میرے پاس واپس ضرور آئے گی۔“

وہ تیزی سے بولا پھر خاموش ہو گیا۔

”تم کہہ کے تو دیکھو۔“

مراد راجہ چند لمحے اس کی آنکھوں کی ہٹ دھری دیکھتا رہا پھر گہری سانس بھری۔

”ہم شکار باز صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔

ہم زمانوں کے مسافر ہیں۔ وقت میں سفر کرتے

ہیں۔ ہر زمانے میں شکار بازوں کا ایک راہبر ہوتا ہے۔ ان کا سربراہ۔ تمہاری یادیں اگر کوئی لوٹا سکتا

نہا تو وہ بھی ہے۔“

”اور وہ کون ہے؟“

”وہی جو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور وہ مجھے

کبھی تمہاری یادیں لوٹا سکا۔“ وہ صراحت سے علم

میں تفرستے ہوا۔ ”لیکن شاید تمہاری دنیا کا وہی

تم پہ رحم کھالے۔“

”ہماری دنیا کا شکار باز! وہ جھانکا۔ کمرے

ڈھیلے پڑ گئے۔ آہستہ سے سیدھا ہوا۔ ”تو فی الحال

نہیں ہوں گے۔ وہ نسل در نسل اپنے علم کو منتقل کرتے

جائیں گے اور ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔“

”ہم زمانے کے مسافر ہیں۔ ہم بھی ختم نہیں

ہوں گے۔“ وہ تقاضے سے مسکرایا۔ ”تمہارے پاس

ایک رات ہوگی وان فاتح۔ تمہیں اپنا دنیا کے شکار

باز راہبر سے ملنا ہوگا۔ وہ تم سے تین سوال پوچھے گا۔

اگر تم ان کا جواب دے سکو تو تمہارے لیے امید نکل

سکتی ہے۔“

”کیسے سوال؟“

مراد راجہ نے لباس شانوں سے جھٹکا اور اٹھ

کھڑا ہوا۔ ہاتھ کمر پہ باندھ لیے۔

”معلوم نہیں۔ ہر زمانے کے اصول اور سوال

مختلف ہوتے ہیں۔ وقت کا چکر مکمل ہونے پہ جب

بھی چابی تحلیل ہوتی ہے وہ شکار باز راہبر کے پاس

چلی جاتی ہے۔ تاہم جب بچپن میں تمہاری دنیا میں گئی

تھی تو وقت کا چکر مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے وہ چابی

ٹوٹ گئی اور کئی برس تحلیل نہ ہوئی۔ تم نے میری دنیا

میں آتے وقت دروازہ کھول ڈالا جس سے چابی تحلیل

ہوتے ہی میرے پاس تو آ گئی لیکن وہ ناکارہ ہو چکی

تھی کیونکہ تم نے وقت کا چکر خراب کر دیا ہے۔“

وہ سانس لینے کو رکا۔ فاتح غور سے اس کو دیکھ

رہا تھا۔

”اب جو چابی میں تمہیں دے رہا ہوں یہ

تحلیل ہوتے ہی تمہارے زمانے کے شکار باز کے

پاس چلی جائے گی۔ اس چابی میں تمہاری بادی قید

”کون؟“

”وقت کا مسافر ہوں اور اپنی یادیں واپس لے جاتے آیا ہوں۔“

دوسری طرف چاموشی چھا گئی۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھلا۔ وان قانع نے چہرہ اٹھایا تو اپنے سامنے چوکھٹ پہ ایک اڑھڑ عمر آدمی کو کھڑے پایا۔ اس نے گرتے پا جاے کے اوپر ناف کے گرد کپڑا باندھ رکھا تھا اور سر پہ جینح کپ جھکی ٹوٹی تھی۔ ٹھوڑی پہ ہلکی سی ڈاڑھی بھی تھی۔ آنکھیں کینڑ کے قانع کو دیکھا اور مسکرایا۔

”خوش آمدید۔“ پھر راستہ چھوڑ دیا۔

اس نے جوتے چوکھٹ پہ اتارے اور اندر داخل ہوا۔ وہ آدمی آگے بڑھتا گیا۔ صاف ستھری چھوٹی سی راہداری عبور کر کے ایک دیوان خانے میں اسے لے آیا جہاں فرش نشست چھٹی تھی۔ دیوار پہ ویلٹ بنے تھے جن کے خانوں میں کاج کی بہت سی بوتلیں رکھی تھیں۔ اگر مٹی اور خوشبودار موم بتیوں نے فضا کو مضطر کر رکھا تھا۔

وہ دونوں آنے سامنے چٹائی پہ دوڑانو ہو کے بیٹھ گئے تو اس آدمی نے غور سے قانع کو دیکھا۔

”وقت کے مسافر ہو؟“

”اپنی خوشی سے نہیں گیا تھا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”غلطی سے دروازہ مار کیا تھا۔ صبح اس چابی کے تحلیل ہوتے ہی قدیم ملاکہ میں گزرے پل بھول جاؤں گا۔“

”یاد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ وہ نرمی سے مسکرایا۔

”میں فرار ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کیا ہے اس کو یاد رکھ کے اس کا سامنا کرنے والوں میں سے ہوں۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں جو اس جادو کا توڑ ہو سکے اور صبح پہری یادداشت نہ کھوئے۔“ اس آدمی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں قانع کی گردن میں پڑی زنجیر پہ جمی تھیں۔

”یادداشت تو کھو جائے گی لیکن ایک صورت

ہے۔ اگر تم اس راہبر کو ڈھونڈنا چاہتے ہو تو تمہیں پانی اس کارستہ خود دکھائے گی۔ اب میں نے تمہیں سب بتوایا ہے۔ اب ہم اس مقابلے میں برابر ہیں۔ تمہاری یادداشت واپس آئے یا نہ آئے میری بی واپس ضرور آئے گی۔“

”وہ سمجھتے ہیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

ہم چلے گئے

سولہ جولائی کی رات تالیہ اور ایم کے اہل کے لیے نکل پڑے تو وہ پولیس اسٹیشن چلا آیا۔ اپنا بیان ریکارڈ کروایا مگر یہاں سے وہ گھر نہیں گیا۔ اس نے گردن میں پڑی چابی کو ہاتھ میں اٹھا کے دیکھا۔ ”مجھے اپنے وقت کے شکار باز سے ملنا ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔“

چابی سے سنہری سا پتھہ نکلا اور فضا میں اڑنے لگا۔ قانع نے گاڑی وہیں چھوڑی اور اس سنہری پتھہ کے پیچھے قدم۔ قدم چلتے لگا۔ اس پتھہ کو اس کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہوا میں تیرتا پر صرف قانع کو راستہ دکھانے کے لیے تھا۔

وہ مٹی میں دیرویران سڑکوں پہ چلتا رہا۔ چابی ہر گزرتے پل کے ساتھ بھاری ہوتی جا رہی تھی مگر وہ اس وزن کو برداشت کیے ہوئے تھا۔ پتھہ اڑتا چلا جا رہا تھا۔

ملاکہ کے ایک مہمان آباد علاقے میں وہ اسے کھینچ لایا۔ وہاں مقام میں ایک منزلہ گھر بنے تھے جن کی خردکی چھین تھیں اور دیواریں سرمئی ٹیلی اینٹوں کی بنی گئی تھیں۔ وہ درمیانے درجے کا علاقہ تھا اور رات کے اس وقت سنسان پڑا تھا۔

پتھہ ایک دروازے کے پائندان پہ جاگرا اور ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ منزل آپہنچی تھی۔

وان قانع نے ہٹلی سے دستک دی۔ پھر گھنٹی بجائی۔

دھماکہ مسموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے دروازے کے پیچھے سے سوال کیا۔



ہے اس کے واپس آپنے کی۔“

”بتائیے۔“ وہ محل سے بولا۔ گردن میں پڑی زنجیر بھاری ہو رہی تھی۔

”اگر تم وقت کے تین سوالوں کا جواب پالو تو تمہاری یادیں وقت تمہیں خود لوٹا دے گا۔“

”پوچھیے۔ وہ تین سوال کیا ہیں۔“

شکار باز کی نظریں زنجیر سے اٹھ کے اس کے چہرے پر جا رکیں۔

”تو پھر بتاؤ۔ پہلا سوال، کوئی کام شروع کرنے کے لیے سب سے اہم وقت کون سا ہے؟

دوسرا سوال۔ انسان کی زندگی کا سب سے اہم کام کون سا ہوتا ہے؟

تیسرا سوال انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہونا چاہیے؟“

چند ثانیے کے لیے اس دیوان خانے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں نے ہلکے سے ہنسی۔

”اور اگر میں کہوں کہ مجھے ان تینوں سوالوں کے جواب معلوم ہیں تو؟“

”تو میں یہ کہوں گا کہ اکثر کہتے ہیں، لیکن ان کا جواب دینا کافی نہیں ہے۔ تمہیں ان کا جواب

”پانا“ پڑے گا۔ کل جب تمہاری یادداشت کھو جائے گی تو تمہارا امتحان شروع ہو گا۔ جس دن تم ان

جوابات کا، دل کے اطمینان سے اقرار کر لو گے تو وقت تمہیں تمہاری یادداشت لوٹا دے گا۔ لیکن ایک

شرط ہے۔“

”کہیے۔“ وہ بدقت بولا۔ چابی بھاری ہو رہی تھی۔ شاید وہ دیکھنے بھی لگی تھی کیونکہ اسے گردن پہ

گرمانش محسوس ہو رہی تھی۔

”تم کسی سے بالواسطہ مدد نہیں مانگ سکتے۔ تم اپنے لیے کوئی تحریر یا اشارہ چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ تم

اس امتحان میں نفل کر کے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تم ان سوالوں کے بارے میں کسی کو بالواسطہ کچھ نہیں بتا

سکتے ورنہ تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ تمہیں ان کا

جواب فطری طریقے سے خود حاصل کرنا ہو گا۔“

”اگر کوئی اپنے طور پر میری مدد کرنا چاہے تو؟“

”تم ان تین سوالوں کے بارے میں کسی کو بتا

سکتے ہو لیکن اس سے مدد نہیں مانگ سکتے۔ اس کے علاوہ جو کہو اس کے لیے تم آزاد ہو۔ کوئی خود سے

تمہاری مدد کرنے وہ اس کے لیے آزاد ہے۔“

ادھیڑ عمر آدمی دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

”یہ سوال تم سے کل کے بعد اگر کوئی زبانی

کلامی پوچھ بھی لے تو بھی ان کا جواب دینا درکار نہیں۔ تمہیں اپنے عمل سے ان کا جواب خود کو دینا

ہو گا۔ جس دن تمہاری زندگی میں یہ جوابات شامل ہو جائیں گے تمہاری یادیں میں تمہیں لوٹا دوں گا۔“

رات پچھلتی جا رہی تھی اور شکار باز کی آواز بھی

ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے بوجھ کے ساتھ ن

رہا تھا۔

”یعنی میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”شہزادی تاشہ کو؟ ہرگز نہیں۔ اگر تم نے اسے

چھوڑ دیا تو آخری سوال کا جواب کیسے دھوڑ پاؤ گے۔“

”آپ اسے جانتے ہیں؟“ فاتح نے ابرو

اٹھائی۔ پراسرار آدمی مسکرایا اور شلیف کی طرف

اشارہ کیا جہاں کاغذ کی خنجریں صراحیوں میں تھیں۔

”ان میں سے تیسرے نمبر والی میں تالی کی

یادداشتیں ہیں۔ اس کو ایک سوال کا جواب مل گیا تھا

اس لیے کچھ یادیں واپس چلی گئیں۔ تم دیکھ سکتے ہو

کہ یہ بھری ہوئی نہیں ہے۔ اور وہ جو خالی صراحی ہے

وہ تمہاری ہے۔ صبح یہ بھر جائے گی۔“

فاتح نے کپٹی کو چھوا۔ چابی کا وزن بڑھتا جا رہا

تھا۔

”اگر اسے میرے ساتھ رہنا ہے تو اسے ایک

بات کا علم ہونا ضروری ہے۔“ فاتح نے قریبی میز پر

دھرا قلم کاغذ اٹھایا اور صفحے پہ چند ہندسے لکھنے

”وہ میرے قدموں کے نشانات کا پتہ چھوڑے

یہاں ضرور آئے گی۔ جب وہ آئے تو اس کو یہ

بند دے دیجیے گا۔“ صفحہ پھاڑ کے اس کی طرف  
 ہدایہ۔ شکار باز نے اس کا غد کو تہ کیا اور جیب میں  
 رکھا۔  
 ”درست وقت اور درست جگہ پر میں اسے یہ  
 پہنچا دوں گا۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔“  
 وان فارح نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور  
 اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”مجھے واقعی جانا چاہیے۔ ایک ادھوری ای میل  
 کو مکمل کرنا ہے مجھے۔“  
 واپسی کا راستہ طویل تھا مگر کٹ گیا۔ جیب میں  
 کچھ سکے تھے جن سے اس نے رک کے ایک فون  
 بوتھ سے عثمان کو کال کی اور ایک رقم ایڈم کے اکاؤنٹ  
 میں ڈلوانے کو کہا۔ ساتھ ہی اپنے لیے نئے موبائل کا  
 بندوبست کرنے کا حکم دیا۔  
 واپس گھر آ کر اس نے ای میل کی آخری سطور  
 مٹائیں اور اسے دوبارہ سے لکھا۔ پھر ایڈم کو ایک ای  
 میل الگ سے لکھی۔ وہ چاہتا تھا کہ تالیہ کو ان پیسوں  
 سے ایڈم چالٹیس اور کو کو بچل بھیجا کرے۔  
 وہ سب کچھ بھول بھی جائے تو بھی تالیہ نہ  
 بھولے کہ وہ دونوں ابھی تک مکمل طور پہ وقت کی  
 تلاشی سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔  
 ☆☆☆  
 واپس چالیہ دن میں آتے ہیں۔  
 وان فارح کے آفس کے باہر سیکرٹری کا کیمین  
 تھا۔ اس کے آگے چھوٹا سا لاؤنج بنا تھا۔ لاؤنج کے  
 صوفے پہ براجمان تالیہ اس کیمین کے ساتھ کھڑے  
 سرگوشیوں میں بات کرتے عثمان (سیکرٹری) اور  
 عبداللہ (باڈی مین) کو صاف دیکھ سکتی تھی۔  
 عثمان اب دونوں ہاتھ اٹھا کے سلی دینے والے  
 انداز میں اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ عبداللہ کا چہرہ بچہ گیا۔  
 سر اثبات میں ہلایا۔ شکوہ کنناں انداز میں تالیہ کی  
 طرف دیکھ کے کچھ کہہ بھی ڈالا۔ عثمان اس کے  
 کندھے کو چھپتا مڑا ناکی کی ناٹ درست کی اور  
 چہرے پہ مسکراہٹ سجائے تالیہ کی طرف آیا۔

”چے تالیہ۔“ خوشامدی انداز میں کہتا اس کے  
 قریب صوفے پہ بیٹھا۔  
 وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی ناقدانہ انداز  
 میں اسے دیکھنے لگی۔  
 ”کیا مجھے جاب دینے سے انکار کر دیا ہے فارح  
 صاحب نے؟“  
 ”نہیں نہیں... اصل میں... ابھی کوئی دیکھنی  
 خالی نہیں تھی لیکن عبداللہ کچھ دن سے چھٹی مانگ رہا  
 تھا تو کیوں نہ کچھ دن آپ عبداللہ کی جگہ پہ کام کر  
 لیں۔“  
 تالیہ نے ٹانگ دوسری ٹانگ سے ہٹائی اور  
 سیدھی ہوئی۔ تاثرات بدلے۔ ”باڈی وومن کی  
 جاب؟“  
 ”بس کچھ دن کے لیے.... عبداللہ جیسے ہی  
 واپس...“  
 ”عبداللہ ابھی تو چھٹی سے واپس آیا تھا۔ غالباً  
 آپ اسے چند دن کے لیے چھٹی پہ بھیج رہے ہیں  
 کیونکہ باس کو لگتا ہے کہ (بند دروازے کو دیکھا) چے  
 تالیہ چند دن سے زیادہ نہیں نکلتے گی۔“  
 ”ہرگز نہیں میم....“ عثمان شرمندہ ہوا۔ تالیہ  
 نے ماتھے پہ ہل ڈالے، ہنکارا بھرا۔  
 ”خیر... آپ باس کو جا کے بتائیں کہ تالیہ مراد کو  
 یہ جاب منظور ہے۔ کب سے کام شروع کروں؟“ وہ  
 ایک دم طنزاً مسکرا کے بولی۔  
 عثمان کو شاید توقع نہ تھی۔ لمبے بھر کو چپ ہو گیا۔  
 پھر مسکراہٹ لیوں پہ واپس لے آیا۔  
 ”کل سے۔ آج آپ پورا دن خود کو کوئی طور پہ  
 تیار کر لیں۔“  
 وہ اٹھنے لگا تو وہ بولی۔ ”وہیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟  
 کیا وان فارح کی حفاظت کرنی ہوگی؟“  
 ”وہ تو باڈی کا رٹز کا کام ہے۔“ عثمان جھینپ  
 کے ہنسا۔ ”یہ باڈی وومن کی جاب ہے۔ ہر سیاست  
 دان کے ساتھ ایک سیکرٹری اور چند کارٹرز ہوتے ہی  
 ہیں مگر ایک پرسنل ایڈ بھی ہوتا ہے جو باڈی مین کہلاتا



ہے۔ وہ بالکل بھی ہاڈی کارڈ جیسا نہیں ہوتا۔  
 ”اور اس کا کام کیا ہوتا ہے؟“ وہ گردن اٹھا  
 کے سامنے کھڑے عثمان سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”باس کے کھانے پینے اور کپڑوں کا خیال  
 رکھنا۔ چیزیں پکڑانا، کوٹ، داغ لگا ہے تو اسے  
 صاف کرنا۔ ان کی صحت کا خیال رکھنا۔ کام کی زیادتی  
 باس کو اپنا آپ بھلا دیتی ہے تو آپ ان کو ازرقی بارز  
 اور کافی لاکے دیتی رہیں گی۔ وہ کار سے ٹکس تو ان  
 کے ہاتھ سے خالی کپ لے لیتا وغیرہ وغیرہ۔“  
 ”پندرہویں صدی کے ملاکہ میں یہ کام غلام کیا  
 کرتے تھے۔ وان قارح مجھے غلام بنانا چاہتے ہیں؟“  
 وہ اداسی سے مسکرائی۔

”نہیں بچے تالیہ۔ یہ جاب بہت قابل مہر و سا  
 لوگوں کو دی جاتی ہے۔“

عثمان کے جانے کے بعد وہ انھی اور کرسی پہ  
 خاموش بیٹھے عبداللہ کی طرف آئی۔  
 ”میں امید کرتی ہوں آپ کو مجھ پہ غصہ نہیں آ  
 رہا ہوگا کیونکہ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے آپ کی  
 جاب لے لی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی تو  
 وہ جلدی سے کھڑا ہوا۔

”ہرگز نہیں“ بچے تالیہ۔ مجھے شرمندہ مت  
 کریں۔“ وہ جھینپ گیا۔  
 ”میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو آپ کی  
 جاب واپس مل جائے گی۔ آپ میری طرف سے دل  
 بہ امت کیجیے گا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ باس کبھی بھی مجھے  
 یوں ضائع نہیں کریں گے میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے  
 نہیں اور ایڈ جسٹ کر دیں گے۔“ وہ خوش دلی سے  
 مسکرا کے بولا تو تالیہ نے بند دروازے کو دیکھا۔  
 ”عبداللہ؟“ آواز دھیمی کی۔ ”کیا آپ مجھے  
 میری جاب سکرپشن لکھ کے دے سکتے ہیں؟“  
 ”بے ذی؟“ عبداللہ نے سوالیہ ایمو اٹھایا۔  
 تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”قارح صاحب کو آپ سے بہتر کون جانتا ہو

کا۔ اگر آپ مجھے قبولہ کا لکھی کر دیں، کہہ دیں  
 کے اندر کیا کیا شامل ہے تو وہ ۱۰۰۰ روپے  
 کا۔“  
 ”آف کورس ہے تالیہ۔ میں ابھی کو دیکھ  
 ہوں۔ آپ نے کتنی سبھی میں پورا کر دیا ہے۔  
 جانتا ہوں کہ باس کو مشکل نہ ہوئے۔ ان نے فوراً  
 سے چھوٹی ڈائری لکھی اور قلم مولا۔ چھوٹی  
 اور جلدی جلدی کا غلاف لکھنے لگا۔ تالیہ نے  
 سمجھاتا بھی جا رہا تھا۔ وہ تین گھر سے گزرتی  
 گئی۔

باڈی ٹن کو آفس تک نہ دتا تھا۔ یہ قریب  
 کرسی ملتی تھی۔ ہنسنے۔

تالیہ

”کیا پڑھ رہی ہو؟“ وہ پتھر میں دھاپے  
 کے برآمدے کے زینے پہ بیٹھی عبداللہ کے  
 کاغذات کو پڑھ رہی تھی جب قاتق سمجھا کے تالیہ  
 تالیہ چمکی پھر کاغذات کی طرف نہ دھاپے۔  
 ”مجھے وان قارح نے پرسنل ایئر جاب  
 دی ہے۔ یہ میری ہے ذی (جواب دے رہی  
 ہے۔)

اب وہ سامنے گھاس پہ جمی تختی دھپکے  
 دیکھ رہی تھی۔ قاتق نے ٹیک ہاک پہ بتلایا  
 کاغذات کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔  
 ”یہ اس کے آفس کی اعلیٰ ترین جاب ہے۔“  
 ”جانتی ہوں۔“

”جانتی ہوتی قبول کیس کی؟“ یہ تھا ہونٹ۔  
 ”مجھے خزانے سے بہت امید تھی۔“ قاتق  
 خزانہ ہاں نہیں تھا۔ خزانہ کھینچا ہے۔ پہلو ہوا  
 میں داپس کر چکی ہوں۔ چھتہ بیدار کے سویرے  
 پاس کچھ نہیں ہے۔ میں دان قارح کے قریب رہتا  
 چانتی ہوں۔ ایسا ہے تو ایسے ہی کھا۔  
 ”کیا ان کو معلوم ہے کہ قریبی عالم ہو۔“  
 چوڑی۔

”عالم جس سے پوچھ لیا۔“ نہیں مگر اس نے

عام کر ایک کام کیا تھا۔ واٹن تم ایک کام کرو۔ تم ہمارے  
ہاں اور معلوم کرو کہ سولہ اور سترہ ہولائی کی درمیانی  
شعبہ دان خارج کے ساتھ وہاں کیا ہوا تھا۔ ان کو ہمارے  
چوبیس آئی ہیں اور وہ یاد نہیں کر پا رہے کہ ان کے  
ساتھ کیا ہوا۔

”تم ٹوڈ پھ کیوں نہیں معلوم کر لیں؟“  
”کیونکہ میں جانتی ہوں ان کے ساتھ کیا ہوا تھا  
لیکن جو میں جانتی ہوں وہ ان کی عقل سے اوپر ہے۔  
تم ایک عام انسان کے طور پر جو بھی معلوم کرو کی وہ  
ان کی عقل میں آجائے گا۔“ مکر واٹن کی نقلی نہیں  
ہوئی تھی۔

”اگر تمہیں سب معلوم ہے تو ان کو آسان الفاظ  
میں بتا کیوں نہیں دیتیں؟“  
تالیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔  
”وہ یقین نہیں کریں گے۔ کوئی یقین نہیں  
کرے گا۔“

”تو پھر میرے جانے کا فائدہ؟“  
”جو کام انہوں نے سونپا ہے اور جس کے چہرے  
وہ دیں گے اس کو ایمان داری سے کرنے کے لیے  
تمہیں وہاں جا کر اس رات کو ٹریس کرنا ہوگا۔“  
”اور اس رات ہوا کیا تھا؟“ واٹن غور سے  
اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اس رات کے بعد سے تم بدلی  
بدلی ہی ہو تالیہ۔“

”میرے ساتھ کیا ہوا تھا اسے جانے دو۔ لیکن  
ان کے ساتھ جو بھی ہوا تھا وہ کسی سی سی ٹی وی فوٹیج پر  
نہیں ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں یہی معلوم ہوگا  
کہ وہ ایڈم کے ساتھ سوا گیا رہ کے قریب کمر میں  
داخل ہوئے اور پھر ساڑھے گیارہ بجے ایڈم اور  
میرے جانے کے بعد وہ وہاں سے نہیں نکلے۔ یہ  
بات شہوتوں کے ساتھ میں ان کو سمجھا دوں گی تو وہ اس  
رات کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

وہ واٹن کے ہاتھ سے کاغذات لہجی اٹھی۔  
”اب میں اپنی نئی جاب کی تیاری کر لوں۔“  
”اوہ ٹریک... تم کیسے ایک سیاسی پارٹی میں کام

کر کی؟ تم اگر اپنے دل سے اتنا دلچسپ نہیں ہو سکتے  
تو؟“

تالیہ نے ہوا سے منہ اٹھاتے ہوئے کہا ان کی داری  
اور کمرے والی کو بلایا۔

واٹن (پچھلے چوبیس کی نقلی تھی کہ اس نے مقصد  
سے مصیبت آرائی کی۔ تالیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں  
اور اس نے ماتھے پر ہاتھ کا پھیرا لیا۔

”وہ کون ہوتا ہے جو دوسرے کے اعلیٰ کر اس  
کے خلاف استعمال کر کے... اسے مار دے...“  
مہمان سادہ نے کراہی ہے اور پھر یوں آنکھیں میچتا ہے  
کہ اس کا کارڈ ہاتھ لگا رہا تھا ہے اور ہاتھ لگتی  
سکتا کیونکہ... کارڈ لگتا ہے کہ یہاں کا ایسا اعلیٰ ایسا تھا۔  
کون ہوتا ہے وہ ہمارا؟“  
”ایک کام۔“

”ہاں اور سیاست دان بھی۔“  
آنکھیں بند کر کے تالیہ کے تار ایک نھر آتی واٹن کو  
دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

”ہر ایک شخص نے بعد عوام ہاتھ ملتے ہیں انہوں  
کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو ووٹ کیوں دیا۔ یہ تو  
ہمیں لوٹ کے چلے گئے مگر یہ تو سیاست دانوں کا  
اسلام ہے۔ وہ لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کو  
ووٹ دینا عوام کا اپنا آئیڈیا تھا۔ غلط واٹن پو کا۔  
غلط۔“

ایکشن ایک لمبا اسلام ہوتا ہے۔ ایک خوب  
صورت کون گیم۔ عوام ووٹ نہیں دیتا۔ سیاست دان  
عوام کے خوابوں کو ان کا لالچی بن کے استعمال کرتے ہیں  
وہ اتنے دل فریب وعدے کرتے ہیں کہ عوام مجھوت ہو  
جاتی ہے۔ عوام سے ووٹ لیا جاتا ہے۔ اور رہی  
میں... تو میں اس دفتر میں اس لیے کام کر سکتی ہوں  
کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اسلام کیسے چلے جاتے ہیں  
اور ان کا توڑ کیا ہوتا ہے۔“

”واٹن قانع کے اسے قریب کام کرنے کے  
بعد یاد رکھنا کہ تجھے چھپو ہو جائے گی۔“  
”تالیہ کی ہمت اب کوئی چھپو نہیں توڑ



سکتی۔“ پھر یوں تک دو انگلیاں لے جا کر ان کو پھونک مار کے ہوا کے حوالے کیا اور مسکرا کے ہاتھ ہلاتی اندر چلی گئی۔

”تالیہ کو کیا ہو گیا ہے!“ داتن پدوکا کی پریشانوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اتنی ٹڈر اور بے خوف تو کبھی نہیں تھی۔ آخر اس رات کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

جدید ملاکہ کے خوب صورت شہر پہ بارش پوری دو پہر دل کھول کے برسی اور پھر بھی تو شام اترنے لگی۔ سن باؤ کے گھر کا صحن گیا تھا اور بجسے کے قریب ایڈم زمین پہ بیٹھا دستانے چڑھائے اینٹوں کو جوڑ رہا تھا۔ کانوں میں چند زفری لگا رکھا تھا۔

”جی چے تالیہ! صبح تک سارا صحن برابر کر دیا تھا میں نے مگر کیاری والا حصہ بارش نے پھر سے خراب کر دیا۔ جی..... جی اب دوبارہ اسے جوڑ رہا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جینز کے گھٹنے کچھ آلود تھے اور دستانے کارے میں لتھڑے تھے۔ سر پہ ٹوپی تھی اور چہرے پہ مسکراہٹ۔

”آپ بتائیں، آپ کی جاب کا پہلا دن کیسا رہا؟“

دوسری طرف سے چلا بھٹا جواب موصول ہوا۔ ”باڈی دو من بنا دیا مجھے اس غلام نے، جس کی ایک زمانے میں میں نے بھری منڈی میں بولی لگائی تھی۔“ شہزادی تاشہ نے ساتھ میں ”ہونہہ“ بھی کیا تھا۔

”باڈی دو من؟“ اینٹ اٹھاتے ہوئے ایڈم ہنس دیا۔ ”یعنی کہ پرسل ایڈ؟ اوہ جے تالیہ! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ شہزادی کو غلام کی چاکری کرنی پڑے گی۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے اینٹ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گارا زیادہ ڈال دیا تھا اینٹ برابر نہیں بیٹھ رہی تھی۔

”خود جاب لیس ہو اور مجھ پہ ہنس رہے ہو۔ ارے تمہیں تو کوئی باڈی من تک نہیں رکھتا۔ ایک میں جی جس نے شاعی مورخ بنادیا تھا۔“

ایڈم رکا اور دائیں ہاتھ سے دستانہ اہلر کے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ”اور یہ معجزہ ہی ہے کہ آپ کی غلامی کے بعد بھی یہ ہاتھ سلامت ہے۔“ ”اگر ہاتھ سلامت ہے تو ایک جاب ہے تمہارے لیے۔“

”حکم کیجیے، شہزادی۔“ اینٹ کو زور سے دبا۔ وہ اندر دھنک بیٹھ ہی نہیں رہی تھی۔ کچھ تھا جو غلط تھا۔

”قدیم ملاکہ میں تم شاعی مورخ تھے۔ تمام حالات حاضرہ کو رقم کرتے تھے۔ جانتے ہو ایسے شخص کو جدید زمانے میں کیا کہا جاتا ہے؟“

”کیا؟ جے تالیہ؟“ جھنجھلا کر اینٹ نکالی اور کیاری کے شکاف کو دیکھا۔ برابر سطح میں ایک اسی اینٹ کا خانہ خالی تھا۔ اس نے مٹھی سے مزید اینٹ نکالی۔

”رپورٹر!“

”رپورٹر؟“ ایڈم حیران ہوا۔ ساتھ ہی مٹھوں سے مٹی بھی نکالے جا رہا تھا۔

”ہاں ایڈم۔ تم لکھنا چاہتے ہو؟ وہ بھی ج؟ تو تم رپورٹنگ کی طرف چلے جاؤ اور یہ مت کہنا کہ تمہیں جاب کون دے گا۔ میرا ایک کلائنٹ ایک اخبار چلاتا ہے۔ اس سے تمہارے لیے وقت لیا ہے۔ دو دن بعد تم انٹرویو دینے پہنچ جانا۔“

”آپ اور اتنی مہربان؟“

”اور سنو، کوئی اچھی سی تحریر لکھ کے لے جاؤ۔“ تحریر تمہاری سی وی ہوگی۔ اس کو پڑھ کر ہی وہ چھین نوکری دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کریں گے۔“ اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ کہے جا رہی تھی جب ایڈم ایک دم کراہا۔ ”آؤ ج۔“

”یا اللہ! ایڈم.... کیا ہوا؟“

”جی چے تالیہ.... میں انٹرویو دینے ضرور جاؤں گا۔ اچھا میں ٹھہر کے کال کرتا ہوں۔“ اس نے فون بند کیا اور ٹارچ جلا کے مٹی پر روشنی پھینکی۔ ویسے تو شام کی روشنی پھیلی تھی مگر وہ کافی نہ تھی۔ ایڈم نے چہرہ جھکایا اور تعجب سے چٹلیاں سکڑ کے دیکھا۔ اس کے

دہلی ایک تہذیبی گھر تھا۔  
”تہذیب“

وہ گھر سے ایک لگاتار کوئی سو سال پہلے سے  
تھکا ہے۔ جسے جسے مصر و مصر کے تہذیبی آثار  
سنائی دیتی۔ تہذیب کے ہر اقلید۔ مصر و ہندوستان میں  
تہذیب کے ہر اقلید۔ مصر و ہندوستان میں  
تہذیب کے ہر اقلید۔ مصر و ہندوستان میں

”صبح تیرے سر پر مصر۔“ تالیف سنبھل کے مسکرائی  
اور فون کھنی پہ اٹھائے تھے سے لیدر بیک میں  
ڈال۔

”شاعر صاحب سے جا ب کا کہا تو انہوں نے  
مجھے قح صاحب کے اسٹاف میں بطور پاڈی دوڑا  
جا ب دلا دئی۔“ کتہہ جسے اپکا کے یونی۔ مصر و  
سر سے تھکا ایک ہی دفتر میں اس کا جائزہ لے لیا۔  
وہ عام دنوں کے بے ٹکس ساہو تیار ہوئی تھی۔  
پچیس۔ یہی بیجوری فراک۔ گردن میں پھول دار  
روپائی بالوں کی لونی پونی پونی پونی پونی پونی  
والتی ایک برس ایسے لگ رہی تھی۔ وہ ایگزیکٹو پریزائنٹر  
کوٹ وہ تھکی لباس سب سار د تھا۔ ہاں انکی کی سرخ  
آنسو شل انھوں اور بالوں میں لگا سہرے ہرن کے  
چہرے والے کپڑے پہنا رہی تھی۔

”باڈی وومن۔“ اوہ اچھا۔ اچھا۔“ مصر و سنبھل  
کے مسکرا دی۔ پھر ادھر ادھر سارے عملے کو دیکھا جو  
قارح کے انتظار میں کھڑے تھے۔  
”مجھے نہیں معلوم تھا تم سیاسی عزائم بھی رکھتی  
ہو۔“

”عزائم کا تو علم نہیں البتہ وہ تمام خوبیاں  
میرے اندر موجود ہیں جو بی این میں کام کرنے کے  
لیے درکار ہیں۔“  
”گڈ۔“ مصر و نے مسکرا کے شانے اچکا دیے  
البتہ ایک گہری نظر اس پہ ضرور ڈالی جو کار سے ٹیک  
لگائے بے نیازی سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔  
مصر و کے جانے کے بعد گیٹ کھلا اور وہ اندر  
داخل ہوتا دکھائی دیا۔ ٹی شرٹ ٹراؤزر میں ملبوس

دہلی ایک تہذیبی گھر تھا۔  
”تہذیب“  
وہ گھر سے ایک لگاتار کوئی سو سال پہلے سے  
تھکا ہے۔ جسے جسے مصر و مصر کے تہذیبی آثار  
سنائی دیتی۔ تہذیب کے ہر اقلید۔ مصر و ہندوستان میں  
تہذیب کے ہر اقلید۔ مصر و ہندوستان میں  
تہذیب کے ہر اقلید۔ مصر و ہندوستان میں

”صبح تیرے سر پر مصر۔“ تالیف سنبھل کے مسکرائی  
اور فون کھنی پہ اٹھائے تھے سے لیدر بیک میں  
ڈال۔

”شاعر صاحب سے جا ب کا کہا تو انہوں نے  
مجھے قح صاحب کے اسٹاف میں بطور پاڈی دوڑا  
جا ب دلا دئی۔“ کتہہ جسے اپکا کے یونی۔ مصر و  
سر سے تھکا ایک ہی دفتر میں اس کا جائزہ لے لیا۔  
وہ عام دنوں کے بے ٹکس ساہو تیار ہوئی تھی۔  
پچیس۔ یہی بیجوری فراک۔ گردن میں پھول دار  
روپائی بالوں کی لونی پونی پونی پونی پونی پونی  
والتی ایک برس ایسے لگ رہی تھی۔ وہ ایگزیکٹو پریزائنٹر  
کوٹ وہ تھکی لباس سب سار د تھا۔ ہاں انکی کی سرخ  
آنسو شل انھوں اور بالوں میں لگا سہرے ہرن کے  
چہرے والے کپڑے پہنا رہی تھی۔

”سن پاڈ کا کھر۔“ تین تین انوں کا کھر۔“  
پہلا خزانہ وقت کا تھا۔ جس کا نقل کھلتے سے  
دل خالی ہو گیا تھا۔

دوسرا خزانہ انہوں نے مجھے سے اپنے ہاتھوں  
سے دیا تھا۔ جسے کھودنے کے بعد بھی ہاتھ خالی رہ  
گئے تھے۔

ایک دفعہ مذاق مذاق میں تالیف نے کہا تھا کہ  
اس گھر میں ایک تیسرا خزانہ بھی ہونا چاہیے۔  
کیا سن پاڈ کے گھر میں کوئی تیسرا خزانہ بھی دیا  
تھا جس سے کوئی واقف نہ تھا؟  
ایڈم بن محمد یک تک اس تار کو دیکھ رہا تھا۔ اس  
کی گردن کے بال کھڑے ہونے لگے تھے۔

☆☆☆

اس صبح مصر و ہنت محمودناشتے کی میز کی طرف جا  
رہی تھی، جب لاونج کی کھڑکی کے جالی دار پردے کو  
دیکھ کے رکی۔ وہاں سے لان اور پورچ دکھائی دے  
رہا تھا۔ وان قارح کے گارڈ زکار کے قریب مستعد  
کھڑے تھے۔ صبح ہی صبح یہ عملہ پہنچ جاتا تھا اور رات  
تک اس کے ساتھ رہتا تھا۔ مصر و کو ہر صبح عثمان دو  
گارڈز اور عبداللہ کو اس جگہ دیکھنے کی عادت تھی مگر آج





ساتھ بیک واپس ملے اس کا لمس دیکھا۔  
 فاح نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کھانسیوں  
 سے لگا یا۔ دو گھنٹہ بھرے۔ پھر سڑک کنارے  
 بھاگتی عمارتوں کو دیکھ کے کہنے لگا۔  
 ”تم نے راپا چینی کی بیٹی والی کہانی پڑھی ہے؟“

”نہیں سہرا“ وہ سانس روکے اس کے تاثرات  
 پڑھ رہی تھی۔ دل برا ہونے لگا تھا۔

”راپا چینی نے اپنے گھر میں زہریلے پھولوں  
 کا باغ لگایا اور بچپن سے اپنی بیٹی کو زہریلے پھولوں کا  
 رس پلانے لگا۔ تھوڑا تھوڑا زہر اس کے اندر اترتا تو وہ  
 مری نہیں بلکہ زہر سے Immune (محفوظ) ہوتی  
 چلی گئی یہاں تک کہ وہ خود ایک زہریلا پھول بن گئی۔  
 وہ لڑکی جس پھول کو چھوتی۔ وہ اس کے ہاتھ میں  
 مرجھا جاتا۔ جس شخص کو چھوتی اسے اپنے لمس کے  
 زہر سے مار دیتی۔ میں اب تک سمجھتا تھا کہ یہ ناممکن  
 ہے کہ کسی انسان کے ہاتھ میں اتنی کڑواہٹ بھر  
 جائے کہ وہ جس کو چھوئے سر جھٹک کے عثمان کو  
 پکارا۔“ پلیز اس کا کافی کو اس پھول بیچنے والے کو دے  
 آؤ۔ شاید اس کو یہ اتنی بد مزہ نہ لگے۔“

عثمان نے کار روکی۔ خاموشی سے دونوں کپ  
 لیے اور باہر نکل کے ایک پھولوں کے اسٹال تک چلا  
 گیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی لب کاٹتی رہی۔ وہ جواب  
 نہیں دے گی یہ طے تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا تا کہ وہ  
 جواب میں پھٹ پڑے اور وہ اسے نکال دے۔  
 نہیں۔ وہ چپ رہے گی۔ وہ اسے خود کو نکالنے کی  
 معقول وجہ نہیں دے گی۔ تالیہ مراد اگر کڑوی تھی تو  
 وان فاح کو یہ کڑوا گھنٹہ پینا ہی پڑے گا کیونکہ یہ  
 اس کی اپنی خواہش تھی کہ تالیہ اس کے ساتھ رہے۔ وہ  
 صرف اپنا وعدہ بھاری تھی۔

☆☆☆

ملا کہ میں آج مطلع صاف تھا۔ سن باؤ کا گھر  
 خاموشی سے کھڑا اپنے سامنے بنے بازار کو دیکھ رہا

”جی۔“  
 ”کانی میکر استعمال کے بعد صاف کر دینا اور  
 فز پھر نکال کے پھینک دینا۔ یاد سے۔“ ”خیر  
 سے یاد کر لیا تو تالیہ نے بس ایک خاموشی نظر اس پر  
 ڈالی۔ (یہ نہیں جانتی کہ ایک دن میں اس کو ٹرمیڈٹ  
 کروں گی۔ مگر ایک باڈی وومن کی کو ٹرمیڈٹ کیسے کر  
 جاتی ہے؟)

کانی لے کر وہ اندر آئی تو وہ فائزر میں الجھا بیٹھا  
 تالیہ لنگر رکھا تو عادی بولا۔ ”ٹھیکس عہد۔۔۔“  
 پھر رکا۔ نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ تاثرات  
 پاٹ ہو گئے۔ خاموشی سے مگ اٹھایا اور گھنٹ  
 ہرا۔ وہ جان بوجھ کے رک کے اس کے تاثرات  
 کیسے لگی۔

”خود بتائی ہے؟“ گھنٹ بھر کے پوچھا۔

”جی سہرا“

”بہت بد مزہ ہے۔ آئندہ مت بنانا۔ نیچے مال  
 سے لے آنا۔ اسے گرا دو۔“ ناگواری سے کہتے مگ  
 بے دھکیلا اور لیپ ٹاپ سامنے کر لیا۔ ماتھے پہ  
 لکھیں اور آنکھوں میں برہمی تھی۔

ملا کہ کی شہزادی کے لیے صبر کے گھنٹ بھرنا  
 بہت مشکل ہو گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ جان بوجھ  
 کے ایسا کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے وہ خود جاب چھوڑ  
 کے چلی جائے۔

”نیچے مال سے لے آتی ہوں سہرا۔“

”اچھی پارلیمنٹ کے لیے نکلیں گے“ جب لے  
 آتا۔ وہ کی بورڈ پہ ٹائپ کر رہا تھا۔ بے نیازی سی  
 بے نیازی تھی۔ وہ اتنا مصروف تھا کہ اس کے پاس  
 تالیہ کو دیکھنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ پلٹ  
 گئی۔

فاح کار میں بیٹھ چکا تھا جب وہ کافی کے دو  
 گلاس اٹھائے بیک سنبھالتی کار تک آئی۔ عبداللہ نے  
 بتایا تھا کہ وہ پارلیمنٹ والے دن راتے میں دھمک  
 کاٹی پتا ہے۔ اس نے ایک مگ پکڑ لیا اور دوسرا اس  
 کی طرف بڑھا دیا پھر آگے بیٹھ گئی۔ دھڑکتے دل کے



تھا۔ وہاں قطار میں دکانیں اور ریسٹوران تھے۔ باہر کرسیاں میزیں ڈالے بیٹھے لوگ کھانے پینے اور خوش چیموں میں معروف تھے۔

ایسے میں ایک ریسٹوران جون باؤ کے گھر کے عین سامنے تھا اس کے کاؤنٹر کے ساتھ رکھے اسٹول پر داتن بیٹھی تھی۔ کاؤنٹر پر ٹشو کا ڈبار کھا تھا جس سے ٹشو نکال نکال کے وہ آنکھیں پونچھ رہی تھی اور ساتھ کھڑی معرسلز دوین ہمدردی بھرے تاثرات سے اس کی کھان رہی تھی۔

”نہ وہ پیسے بھیجتا ہے نہ ملنے آتا ہے۔ اتنے بڑے آدمی کی نوکری نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا ہے۔“

موٹے موٹے آنسو صاف کرتی وہ گیلی آواز میں بتا رہی تھی۔ سر پر اس کا رب لپیٹے داتن پد کا ایک دکھیا ری عورت لگتی تھی جس کے غم دوسری عورتوں جیسے تھے۔

سبز دوین نے تاسف سے سر ہلایا۔

”یا اللہ.... آج کل کی اولاد۔“ پھر جیسے رائے دینے لگی۔ ”تم اس کے باس سے کیوں بات نہیں کرتیں۔“

”اس کا باس؟ ہونہ۔ وہ وان فاتح... ممبر پارلیمنٹ کا سالہا ہے۔ اشعر محمود۔ اس سے کیا بات کروں۔ میرے جیسوں کو تو وہ اندر گھسنے ہی نہ دے۔“

”وان فاتح کا سالہا؟“ سبز دوین نے چونک کے سڑک کی طرف دیکھا جس کے دوسری طرف سن باؤ کی حویلی تھی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں زہری سے کہتی ہوں وان فاتح سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ تمہیں معلوم ہے۔“ راز داری سے کاؤنٹر پر جھکی۔

”یہ سامنے والی سرخ حویلی وان فاتح کی ہے۔“

”ایں؟“ ردولی ہوئی داتن نے سر اٹھا کے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر منہ ہٹایا۔ ”ادھر ملا کہ میں اس کی حویلی کہاں سے آگئی؟“

”عین کرو میں کی بول رہی ہوں۔“

”خیر۔۔۔ سو بھی سکتی ہے مگر اس جیسے بڑے لوگ یہاں نہیں آتے۔ وہ تو اپنے غلوں سے ہی نہیں نکلتے۔“ آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے اگلنے لگے۔ ”اور ان کے محلات کی حفاظت میرے جیسے جیسے لوگ کرتے ہیں۔“

”نہیں نہیں وہ آتا ہے۔ رک کے دکان والوں کی خیریت بھی پوچھتا ہے۔ میں نے دو مہینے بعد ایک دن کے لیے آ جاتا ہے۔ ابھی جھپٹے بیٹھے ہی وہ آیا تھا۔“ بتانے والی عورت بھی اور شرور ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد داتن سڑک کنارے چلتی فون کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔

”تھوڑا بہت علم ہوا ہے کہ اس رات وان فاتح نے کیا کیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے داتن۔“ تالیہ اس وقت پارلیمنٹ کی گیلری میں بیٹھی تھی اور فون کان سے لگائے روکھے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ نیچے بیٹھ جا رہی تھا۔ ڈیک سجے تھے اور نیچے بیٹھے اشعر اور فاتح دکھائی دے رہے تھے جو خاموشی سے ایک سا بھی کی تقریر سن رہے تھے۔

”میں نے ارد گرد لوگوں کو کریدا ہے۔ ایک نے تو سی سی ٹی وی فوٹیج بھی دکھا دی ہے۔“

”اور اس میں تم نے مجھے اندر داخل ہونے دیکھا ہوگا۔“

”ہاں۔ اور بعد میں ایڈم آتا ہے فاتح کو لے کر۔ پھر پولیس والے آتے ہیں اور کچھ دیر بعد تم اور ایڈم باہر نکلتے ہو مگر تمہارے لباس مختلف ہیں۔“

”اور پھر وان فاتح سو جاتا ہے اور صبح جب اٹھتا ہے تو اس کو گزشتہ رات بھول چکی تھی۔“ تالیہ بے زاری سے دہرا رہی تھی۔ وہ لمبی کتھا سننے کے دوران میں نہیں تھی۔ ”اب گفتیش ایمان داری سے مکمل ہوئی ہے داتن تم واپس جاؤ اور سی سی ٹی وی فوٹیج مجھے بھیج دو۔ میں فاتح کو دکھا دوں گی۔“

”وان فاتح سو یا نہیں تھا۔ وہ تمہارے جانے

کے بعد گھر سے نکل گیا تھا اور صبح فجر سے پہلے واپس آتا تھا۔

تالیہ مراد تیزی سے سیدھی ہوئی۔ نظریے بچے بیٹھے تھے۔ جم گئی جو یہاں سے بہت چھوٹا نظر آ رہا تھا۔  
”وہ گھر سے باہر گئے تھے؟ مگر کہاں؟ انہوں نے تو کہا تھا کہ وہ اب آرام کریں گے۔“

”اطراف والوں نے اڑتے اڑتے سنا ہے کہ اس رات وان فاح کے ساتھ کوئی چوری چکاری کی رات ہوئی تھی اور وہ پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ یہ چھوٹا لائق ہے اور فاح مشہور آدمی ہے، ایسی باتیں سچھی نہیں رہتیں۔“

ایک دم سے معاملہ دلچسپ ہو گیا تھا۔ وہ چونکا ہوئی۔

”دانت... تم معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کیا وہ ماری رات تھانے میں رہا تھا یا کہیں اور بھی گیا تھا۔“  
”میں یہی کرنے آئی ہوں ملاکہ، لیکن وعدہ کرو کہ واپسی پہ تم مجھے سب سچ بتاؤ گی۔“

تالیہ نے جواب دیے ہاتفون بند کر دیا۔ پھر اپنا دوسرا موبائل نکالا اور فاح کو پیغام لکھا۔

”اس رات آپ کے ساتھ چوری کا واقعہ ہوا تھا اور آپ پولیس اسٹیشن گئے تھے۔ کیا ایسا کچھ یاد ہے آپ کو؟“

نیچے اپنی نشستوں پہ بیٹھے افراد بے زار ہو کے ایک قانون ساز کی تقریر سن رہے تھے۔ ایسے میں وان فاح جو فیک لگائے، کال تلے انگلی جمائے بیٹھا تھا، فون کی تحریر اٹھٹا رہا تھا۔ فاح اس کے ان چند کاتیکلس میں تھا جن کے لیے اس نے الگ رنگ ٹون لگا رکھی تھی۔ وہاں موبائل کا استعمال پروٹوکول کے خلاف تھا مگر وہ پروا نہیں کیا کرتا تھا۔ اطمینان سے فون نکالا اور اسکرین کو چھوا۔ پھر جواب لکھنے لگا۔

”ہاں۔ جب میں صبح اٹھا تو میرے دوست کشنر نے مجھے رات میرے بیان کی ویڈیو بھیجی تھی۔“

”آپ نے مجھے ویڈیو کے بارے میں پہلے

کیوں نہیں بتایا؟“

”کیونکہ ظننیتیں تمہارا کام تھا، میرا نہیں۔“ وہاں بے نیازی کا وہی عالم تھا۔

”اوکے، مجھے ویڈیو بھیجیں۔ مجھے وہ دیکھنی ہے، ابھی....“ وہ مانتے پہ بل لیے نایب کر رہی تھی۔

تو وان فاح اس رات فوراً سویا نہیں تھا بلکہ وہ کچھ کرتا رہا تھا مگر کیا؟

فاح نے اس کے بتائے ای میل ایڈریس پہ کشنر کی ای میل بھیج دی۔

تالیہ نے چند زفری کانوں سے لگائے اور گیلری سے باہر نکل آئی۔ باہر ایک خاموش راہ داری میں کھڑے اس نے وہ ویڈیو دیکھی۔

یوں لگتا تھا وہ ویڈیو اس نے خود کو لگی چوٹوں سے مطمئن کرنے کے لیے بنوائی تھی تاکہ جب وہ صبح اٹھے تو اسے رات کے واقعات پہ شک نہ ہو۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے شک پڑ گیا تھا اور اس نے حاکم کو ہائر کر لیا تھا۔

البتہ ایک خیال تالیہ کا دل برا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اتنی محنت سے ویڈیو بنوائی تاکہ جب فاح صبح جاگے اسے بھولے سے بھی ماضی کی کرید نہ ہو۔ وہ تالیہ کو اپنے لاشعور سے بھی نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ واہ فاح صاحب.... واہ.... اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے اور کانوں سے چند زفری صفحے ڈالا۔

سامنے لفٹ کے دروازے کھلے اور فاح، عثمان کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ ایک تھکا دینے والے طویل سیشن کے بعد وہ یقیناً تھک چکا تھا۔

”آپ کا انرجی باز سُر!“ ایک انرجی باراخی سیاہ زنبیل سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ فاح نے بار تھا، اس کو الٹ پلٹ کے دیکھا، پھر ایک خاموش نظر تالیہ پہ ڈالی اور بولا۔

”مجھے انرجی کی ضرورت نہیں ہے، میں بالکل فریش ہوں۔“ بے زاری سے کونے میں رکھے

ڈسٹ بن میں بار اچھال دیا اور راہداری کا موڑ مڑ



کیا۔

تالیہ کے گال دیکھنے لگے۔ اندر موجود شہزادی نے کہا کہ لعنت بھیجو اس نوکری پہ اور ابھی اسے مغرور آدمی کے منہ سے دے مارو.... مگر پھر اس نے کڑوے گھونٹ بھر دیے۔

اگر اس کے ہاتھ لگانے سے ہر چیز فاتح کے لیے زہریلی ہو جاتی تھی تو راپا چینی کی بیٹی کی طرح اس سیاست دان کو بھی اس زہر سے Immune ہونا پڑے گا۔ اس نے زور سے ہنسنے لگا اور اس کے پیچھے ہولی۔

☆☆☆

اس صبح ابھی آفس میں معمولات کا آغاز ہی ہوا تھا کہ لفٹ کے دروازے کھلے اور عمرہ بھٹ محمود اترتی دکھائی دی۔ راہ داریوں میں فائلیں اٹھائے آتے جاتے لوگوں نے مڑ مڑ کے اسے دیکھا مگر وہ ساٹ تاثرات چہرے پہ سجائے سیدھ میں آگے بڑھتی گئی۔ اسکرٹ کے اوپر کوٹ پہنے سر کو اسٹول سے ڈھانے اسٹول کا ایک سر اسانے اور دوسرے کو پیچھے ڈالے وہ ہمیشہ کی طرح مغرور اور طرح دار دکھائی دیتی تھی۔ راستے میں ٹھان نے اسے دیکھا تو فوراً سامنے آیا۔

”مسز عمرہ.... خوش آمدید۔ فاتح صاحب کانفرنس روم میں ایک دوست کے ساتھ ہیں اور....“

”میں اس سے ملنے نہیں آئی۔“ بے رخی سے کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ ٹھان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اشعر اپنے بی این کے چھوٹے سے آفس میں موجود تھا اور میز کے پیچھے کھڑے کھڑے کاغذات پہ سائن کر رہا تھا، کو یا بیٹھنے کا وقت بھی نہ ہو، جب دروازہ کھلا اور عمرہ اندر داخل ہوئی۔

اشعر نے محض نظر اٹھا کے دیکھا پھر دوبارہ کاغذوں کی طرف جھک گیا۔ جڑے کی رگیں البتہ بچھنی گئی تھیں۔

”رہی نے کہا کہ تم آج اس آفس میں ملو گے۔“

شکر ہے یہاں مل گئے ورنہ تم سے ملاقات کے لیے تو لگتا ہے اب وقت لینا پڑے گا۔“

”مبالغہ آرائی سے کام مت لو“ کا کا۔ کوئی کام ہے تو بتاؤ۔“ وہ خشک انداز میں کہتے ہوئے جھک کے کھانا کھٹ دستخط کر رہا تھا۔ عمرہ نے زور سے پرس میز پہ رکھا، کرسی چینی اور بیٹھی۔ پھر چبھتی ہوئی نظریں اشعر پہ جمادیں۔

”تم نے معلوم کیا کہ گھائل غزال کا خریدار کون تھا اور اسے کس نے بھیجا تھا؟“

”کا کا! تم کیوں بھول جاتی ہو کہ میرے پاس ایکشن کے علاوہ کسی چیز کا وقت نہیں ہے۔“

”اور تم کیوں بھول جاتے ہو کہ کسی نے تمہاری بہن کی گیلری میں ایک جعلی عرب شہزادے کو بھیجا تھا۔“

”وہ گیلری جو تم نے میرا حق مار کے لی تھی؟“ اشعر نے جھکے جھکے آنکھیں اٹھا کے کاٹ دار انداز میں اسے دیکھا تو وہ کچھ بول نہ سکی۔ پھر اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ آگے کو جھکی اور غرائی۔

”مجھے اس وقت اس گیلری کی ضرورت تھی۔ تم اپنی بہن کے لیے اتنا پرانا بغض سنبھال کے بیٹھے ہو؟“

”اور مجھے اس وقت تمہاری غیر مشروط سپورٹ چاہیے“ کا کا۔ لیکن تم اپنے شوہر کو روک نہیں سکتی۔“ اس نے زور سے فائل بند کی اور سیدھا ہوا۔ چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

”اف ایٹس... وہ برسوں سے اس کرسی کی تیاری کر رہا ہے۔ میری امید تو دکانیں چلنے اور ضمیر ڈوبنے سے ختم ہو گئی مگر وہ تو ابھی تک وہیں ہے۔“ کسی آدمی کے خواب اس سے چوری کیسے کیے جاتے ہیں تم مجھے سکھا دیتے تو وہ بھی کر لیتی۔ اس سے زیادہ کیا کروں میں تمہارے لیے؟“

”میرے لیے؟ مائی فٹ۔“ وہ غرایا۔ ”میرے لیے کچھ نہیں کیا تم نے؟“ کا کا۔ سب کچھ اپنے لیے کیا ہے۔ اپنے خاندان کو ایکشن کی آلودگی سے دور رکھنے

کے لیے اپنے جینی سکون کے لیے۔“

”ہاں کیا ہے میں نے سب اپنے لیے تو پھر تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ جب سے اس نے ایکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہے تم نے مجھ سے اپنا رویہ کیوں بدل لیا ہے؟“ اس کی آنکھیں بھگینے لگیں۔

”میں بیک وقت کئی محاذوں پہ لڑ رہی ہوں“ ایٹس۔ میں تمہاری وہی بہن ہوں جس نے اتنے سال تمہارا خیال رکھا ہے۔“

”مگر میں تمہارا وہ بھائی نہیں رہا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اسے روک لوگی۔ میں نے اتنے ماہ تمہارے وعدے کے بھروسے پہ تیاری کی اور اب تم کہہ رہی ہو کہ تم بے بس ہو۔“

”میرے بس میں ہے بھی کیا؟“ وہ بھگتی آنکھوں کے ساتھ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اشعر چند لمحے کھڑا اسے چھپتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”تم آجنگ سے کہو اگر اس نے ایکشن لڑا تو اسے تمہیں طلاق دینی ہوگی۔ اسے تمہیں اور چیئر مین شپ میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔“

عصرہ چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر ٹشو پیپر کے باکس سے ایک ٹشو کھینچا، اسے موڑ کے نوک بنائی۔ آنکھوں کے کنارے اس کی نوک سے صاف کیے اور کھڑی ہوئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور چپا چپا کے کہنے لگی۔

”ابھی میں اتنی بے وقوف نہیں ہوئی کہ تمہاری ہر بات کی اندھی تقلید کرنا شروع کر دوں۔ اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ اور مجھے اس پینٹنگ کا خریدار ڈھونڈ کے دو۔ دو دن میں رزلٹ میری ٹیبل پہ ہونا چاہیے اشعر محمود! ورنہ یاد رکھنا، اگر میں بابا کی جائیداد میں سے اپنے حصے کے لیے کورٹ گئی تو چند ہفتوں میں بٹوارا ہو جائے گا اور تمہاری سب سے قیمتی ملکیت..... بابا کا قلعہ..... ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور تم اس دن کو یاد کر کے پچھتاؤ گے کہ کاش تم نے دو دن میں مجھے رزلٹ دے دیا ہوتا۔ مت بھولنا کہ تمہاری بیوی بہن ہوں۔ تم سے پہلے دنیا میں آئی

تھی تم سے زیادہ چال بازی آتی ہے مجھے۔“ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتی مڑی اور تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ اشعر جواباً کچھ نہ بولا، بس چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر زور سے فائل پرے اٹھا کے دے ماری۔

عصرہ باہر آ کے سیدھی ریٹ روم کی طرف آ گئی۔ وہاں ایک ہال میں لمبا سا شیشہ لگا تھا جس کے سامنے قطار میں سنگ بنے تھے۔ وہ ایک سنگ کے سامنے کھڑی ہوئی اور تلے ہاتھوں کا پیالہ رکھا۔ پانی ہتھیلیوں میں بھرنے لگا تو اس نے منہ پہ چھیننا مارا۔

”کیا آپ خوش ہیں مسز عصرہ؟“ منہ پہ پانی پڑنے کی وجہ سے بصارت دھندلی ہو گئی تھی۔ چونک کے چہرہ اٹھایا تو دھندلا گیا سا منظر نظر آیا۔

تالیہ اس کے قریب سنگ سے ٹیک لگائے سینے پہ بازو لیٹے کھڑی تھی۔

”سوری؟“ عصرہ نے پیپر ٹاول سے چہرہ تھپتھپایا اور دوبارہ دیکھا تو منظر واضح ہوا۔ وہ سر پہ ترچھی سفید ہیٹ جمائے آج نیلا پھول دار فراک پہنے ہوئے تھی اور آنکھوں میں ڈیروں سادگی لیے عصرہ کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ خوش ہیں مسز عصرہ؟ اور مطمئن بھی؟“ باہر سے آتا فاح اس آواز پہ دروازے کے دوسری طرف رک گیا۔ عثمان نے سرگوشی کی تھی کہ جذباتی انداز میں اس نے عصرہ کو اشعر کے آنس سے نکلتے دیکھا ہے تو فوراً اس طرف آیا تھا۔ مگر چونکہ یہ لیڈیز ریٹ روم تھا اسے باہر ہی رکتا پڑا۔

”خوش؟ مطمئن؟“ عصرہ آٹھنے میں خود کو دیکھتے ٹشو سے آنکھ کے کنارے پونچھنے لگی۔

”آپ نے اس روز مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ میرے سیاسی عزائم بھی ہیں۔ ایک زمانے میں میرے سیاسی عزائم نہیں تھے۔ میں اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن تھی کہ میری زندگی



قابل رشک نہیں تھی۔“ وہ اطمینان سے ایک لگائے کھڑی کہہ رہی تھی۔ عصرہ خاموشی سے اپنا میک اپ صاف کرتی رہی۔ وہ آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اس کا تالیہ سے کوئی بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

”مگر پھر میں نے اپنے بابا کو دیکھا۔ وہ بہت دانا سیاست دان تھے۔ ایک دنیا پہ حکمرانی کرتے تھے مگر وہ خوش اور مطمئن نہ تھے۔ ان کے اندر بہت آگ تھی۔ ہوس، عزم، طاقت کی خواہش اور پھر میں نے جانا کہ خوش اور مطمئن لوگ دنیا پہ حکمرانی نہیں کر سکتے۔ کسی ملک کو صرف وہی چلا سکتا ہے جو نہ اپنی زندگی سے خوش ہو نہ اپنے معاشرے سے مطمئن۔ جس کے پاس ٹوٹا ہوا دل ہو، وہی اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کے ارادے سے لگتا ہے اور ان کے دلوں پہ حکمرانی کرنے لگتا ہے۔“

وہ بولے جا رہی تھی اور عصرہ اپنے عکس کو دیکھتی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

”مگر جب کسی کی مشکلیں دور ہو جائیں اور اسے بے پناہ خوشیاں مل جائیں تو وہ نیز اس شخص کو Productive نہیں رہنے دیتا۔ آسانیاں اور راحتیں انسان کو نکما بناتی ہیں۔ بڑے مقاصد کے لیے جینے والے.... بڑی بڑی تحریکیں چلانے والے...“

ان سب کے دلوں کا ٹوٹا ہوا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ وہ دوسروں کا غم سمجھ سکیں۔ میں اب خوش نہیں ہوں۔ دکھی ہوں۔ مطمئن بھی نہیں ہوں۔ محرومی کا شکار ہوں۔ پانے کے بعد چھین لیے جانے کی محرومی۔ اس لیے اب میں اس تحریک کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔ اس آفس میں کام کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میں بالکل بھی خوش نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟“

کمرے میں لگے ڈھیروں آئینے ہر کونے میں ان دونوں کا عکس دکھا رہے تھے۔ ہیٹ والی لڑکی سنک سے ایک لگائے کھڑی تھی اور عصرہ ابھی تک آئینے میں دیکھتی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤں کی ڈبی بند کی اور تالیہ کی طرف گھومی۔

”اس سیاست نے مجھ سے میری بیٹی بچھین لی۔ مجھے خوشی اور اطمینان کا اب کچھ بھی کیا ہے۔“

زہر خند لہجے میں بولی اور مڑ گئی۔

باہر کھڑا ان قانع آہستہ سے پلٹ گیا۔ عصرہ کو اس کی ضرورت نہیں تھی وہ جان گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کام سے اس کے آفس میں آئی تو دیکھا وہ لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کر رہا ہے اور اس کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

قانع نے آج بھی اس کی لائی کافی کو چھوا نہیں تھا۔ اس کے دل کو دھکا سا لگا مگر ضبط سے سپاٹ چہرے کے ساتھ اندر آئی اور فلیٹ کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اسے وہاں رکھی قانکر کی ترتیب دینی تھی۔

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ خوش اور مطمئن لوگ اچھے حکمران نہیں بن سکتے۔“

ہیٹ والی لڑکی آواز پہ چونک کے مڑی۔ وہ ٹائپ کرتے ہوئے عینک لگائے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔

(تو اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ کیا کھرا آدمی تھا۔ دو منٹ بھی نہیں چھپا سکا اس بات کو۔) ”کیا مجھے غلط لگتا ہے سر؟“

”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اتنی معقول بات تمہارے ذہن میں کیسے آئی؟“ وہ اس کو آواز عقل مند نہیں سمجھتا تھا، یہ تو طے تھا مگر انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ وہ مسکرا دی۔

”مجھے کسی نے کہا تھا ایک مرتبہ کہ خوش اور مطمئن لوگ حکومت نہیں چلا سکتے اور میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ اب مانتی ہوں۔“

”کس نے کہا تھا؟“ وہ مصروف سے انداز میں بدستور ٹائپ کرتے پوچھ رہا تھا۔

”تھا کوئی خود غرض انسان۔“ وہ گہری سانس لے کر پلٹ گئی اور ڈسٹر اٹھا لیا۔

”تم خوش اور مطمئن کیوں نہیں ہو اپنی زندگی سے؟ ہر چیز تو ہے تمہارے پاس۔“ خود غرض انسان

ایسے جیسے جھیل کے پانی پہ سنہری کرنیوں نے  
سونے کا خول چہ حار کھا ہو۔ اور اس دیکھتے پچھلے  
سونے کے اندر ایک منظر انجرا انجرا کے محدود دور پر  
تھا۔

سنہرا چمکتا تاج اس کے سر پہ بٹا تھا اور تاج  
کے پیچھے سے نکلتا سرخ رنگی کپڑا اس کی کمر تک گرا  
تھا۔ پاؤں کو چھوٹا کام دار سرخ لباس بنے، وہ قد نیم  
ملا کہ کی اس سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ کئی پہ  
خالی نوکری لٹکی تھی۔

یہ سن باؤ کی حویلی کے سامنے بنی سڑک تھی جس  
کے دوسری جانب درختوں سے مزین بنرہ زار تھا۔  
وہاں جگہ جگہ جنگلی اور دیسی پھول گئے تھے۔ تالیہ ایک  
پودے کے سامنے رکی اور جھک کے پھول توڑنے  
لگی۔ دفعتاً درختوں میں ہلچل ہوئی۔ اس نے جھکے  
جھکے گردن اٹھائی، پھر مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔

”آپ آج جانا نہیں گئے تو آگے؟“  
وہ سامنے سے گھوڑے کی باگ تھاے چلا آ رہا  
تھا۔ جواب دینے کے بجائے پہلے مسکرا کے سر کو  
خصوص انداز میں جنبش دی۔

”شہزادی سلام۔“ پھر قریب چلا آیا۔ سفید  
کرتے یا جامے میں ماتھے پہ بال بکھیرے قدم  
اٹھا تا غلام شہزادی کو وہاں دیکھ کے جیسے مفلوظ ہوا تھا۔  
”آپ نے آج مجسمہ بنانے کا کام نہیں کیا  
شہزادی؟“

”ایڈم اندر ہے اور کام کر رہا ہے۔ میں باہر  
پھول توڑنے آئی تھی۔“

وہ اس کے قریب آچکا تھا۔ دونوں اب آسنے  
سامنے سڑک کنارے درختوں تلے کھڑے تھے۔  
فانچ نے گھوڑے کی ہاگ اب تک تمام رکھی تھی۔  
نظریں جھکا کے پھولوں کی نوکری کو دیکھا اور مسکرایا۔  
”اور تمہیں لگتا ہے کہ میں آسانی سے یقین کر  
لوں گا کہ تم یہاں صرف پھول چٹنے آئی ہو۔“

(باقی آئندہ ماہ)

نے سوال کیا۔  
”ہر چیز ہونے سے کوئی خوش ہو سکتا ہوتا تو  
شہزادیاں سب سے زیادہ خوش ہوتیں سر۔“  
”تم ناشکری ہو لڑکی!“ وہ گہری سانس لے کر

کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ چپ چاپ فولڈرز صاف کر  
کے صلیف کے اندر رکھتی گئی۔ یکدم چھناکے کی آواز آئی  
تو وہ کرنٹ کھا کے پٹئی۔ فانچ بے دھیانی میں کرسی پہ مڑا  
تو ہاتھ کافی کے مگ کو لگا۔ مگ میز پہ اوندھا ہو گیا جسے  
اس نے تیزی سے تھام لیا۔ مگ خچ گیا مگر کافی میز پہ  
گر گئی۔

”اس کو یہاں سے ہٹا لینا تھا، ناشہ!“ وہ  
قدرے کوفت سے بولا۔ کافی ہاتھ کی پشت پہ بھی  
گری تھی مگر صد شکر کہ اب تک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔  
تالیہ تیزی سے وہاں آئی اور جلدی سے ٹشو پاکس سے  
ٹشو کھینچ کر نکالے۔ فنانچ میز صاف کی۔ دو ٹشو سے  
فرش پہ گرے مانع کو ڈھانپا۔ پھر فانچ کو دیکھا جو ہاتھ  
کی گیلی پشت کو بے زاری سے دیکھ رہا تھا۔ پاکس دور  
تھا اور وہ ٹشو نہیں نکال سکتا تھا۔ تالیہ نے پاکس کے  
بجائے اپنا بیگ اٹھایا جو صلیف پہ رکھا تھا اور اندر سے  
گلیے واپس کا پیکٹ نکالا۔ مویجے کی خوشبو والے  
واپس دان فانچ کے پسندیدہ تھے۔ اس نے پیکٹ  
کھولا تو ایک دم سارے میں مویجے کی خوشبو پھیلنے  
لگی۔ اس نے ادب سے پیکٹ سامنے کیا۔

”جاؤ، ناشہ! میں خود کر لوں گا۔“ سرد مہری سے  
واپس کو جھٹکا اور آگے بڑھ کے ڈبے سے سوکھے ٹشو  
کھینچے۔ پھر انہی سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

تالیہ کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ مویجے میں  
جیسے ایک دم کافور کی بو بھل گئی۔

وہ چپ چاپ کام سمیٹ کے باہر نکل گئی۔ نہ  
کوئی سخت جواب دیا، نہ لمحے کا اظہار کیا۔ اسے دکھ ہوا  
تھا۔

باہر کرسی پہ بیٹھے اس نے ہتھیلیوں پہ چہرہ گرا دیا  
اور درخشے کی دیواروں سے بنے کیمین کو دیکھنے لگی۔  
ان کے شیشوں پہ مختلف رنگوں کی روشنی پھری تھی۔